گندی گلی
محی الدین نواب

گندی گلی

اپنی اپنی انا اور اپنی اپنی ذات کی گندی گلی کی کہانی۔
ان منافق انسانوں کی کہانی جو اپنے سامنے گندگی برداشت نہیں کرتے'
پیچھے برداشت کرلیتے ہیں کیونکہ پیچھے کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔

اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے دروازے پر دستک دی۔ دستک کی آواز' کھٹ کھٹ کھٹ تھی۔ دل کی آواز دھک دھک دھک تھی۔ دونوں آوازیں گڈمڈ ہو کر' دھک کھٹ۔ دھک کھٹ' کی منافقت پیش کر رہی تھیں۔ کسی گٹر کے سامنے اپنے لباس پر پرفیوم اسپرے کرنے والا لازماً خوشبو اور بدبو کے درمیان گرفتار رہتا ہے۔ اس نے دوسری بار دستک دیتے ہوئے سوچا۔ "ثمینہ دل کی آواز پر آئے گی۔ دروازہ کھولے گی۔ پھر سب سے پہلے اپنا دیدار کرائے گی۔"

وہ خیالوں میں مسکرا رہی تھی۔ دروازہ کھول کر میٹھی ناراضگی سے پوچھ رہی تھی۔ "کہاں کھو گئے تھے؟ میں پچھلے دو برس سے جاگ رہی ہوں۔ ہر آہٹ پر دروازہ کھول دیتی ہوں۔ ہوا کا جھونکا آتا ہے' تم نہیں آتے۔ بولو کہاں کھو گئے تھے؟"

اچانک خیالات فنا ہو گئے۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ ایک کرخت چہرے والی خاتون نے کرخت آواز میں کہا۔ "خالد تم؟ تم پھر حرام کی روٹیاں توڑنے آگئے؟ لعنت ہے تم پر ارے بے غیرت' تم ہمیں عزت سے جینے نہیں دیتے نہ سہی' عزت سے مرنے تو دو۔ ہمارے بعد اس گھر میں آکر چراغاں کرنا۔ آخر یہ تمہارے باپ کا گھر ہے۔"

خالد نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "خدا کے لئے بھابی جان! آپ کی آواز دوسرے گھروں تک جا رہی ہے۔ عزت میرے ہاتھ میں بھی ہے اور آپ کے ہاتھ میں بھی' ذرا دروازے سے نکل کر دیکھیں' میں عزت کو چار چاند لگانے والی ایسی ایسی چیزیں لایا ہوں کہ آج سے محلے کے ہر گھر میں ہمارے گھر کی بات ہوا کرے گی۔"

بھابی جان نے دروازے سے نکل کر سڑک پر دیکھا تو آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ایک بڑے ٹرک پر دنیا جہان کا سامان لدا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں ایک بڑا سا فریج اور چھبیس انچ کا رنگین ٹی وی نظر آیا۔ واشنگ مشین بھی جھلک دکھا رہی تھی۔ بھابی

جان نے اپنی چڑھتی اترتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ............ یہ کس کا سامان ہے؟"

خالد نے فخر سے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "یہ سب ہمارا ہے یہ سامان میں لایا ہوں۔"

وہ ٹرک پر لدے ہوئے سامان کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "کیا جیل سے چھوٹنے والے قیدیوں کو اتنی ساری چیزیں دی جاتی ہیں؟"

خالد نے جلدی سے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "خدا کے لئے بھابی جان آہستہ بولیں۔ میں باہر کا سامان گھر لا رہا ہوں اور آپ گھر کی بات باہر پہنچا رہی ہیں۔ آخر یہ سب عزت سے جینے کا سامان ہے۔ آپ بھی عزت سے آہستہ بولیں۔"

ٹرک ڈرائیور اور مزدور سامان اتار کر لا رہے تھے۔ گھر کے اندر رازدارانہ سرگوشی تھی کہ خالد واپس آگیا ہے جبکہ خاندان کی عزت کا خیال نہ رکھنے والے کو واپس نہیں آنا چاہئے تھا۔ ابھی گھر کے تمام افراد پس و پیش میں تھے کہ اسے اندر آنے کی اجازت دینا چاہئے یا نہیں؟ وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ پورے گھر میں اور پورے سماج میں معزز اور برتر کہلانے کا سرٹیفکیٹ ساتھ لایا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورے محلے میں چرچا ہونے لگا تھا کہ صمد یار خان کا چھوٹا نالائق بیٹا خالد یار خان سب سے بڑے سائز کا فریج، رنگین ٹی وی، وی سی آر، واشنگ مشین، ریموٹ کنٹرول سے اڑنے والے بچوں کے ہوائی جہاز، ویڈیو گیمز، ریڈی میڈ گارمنٹس، قیمتی ساریاں، ولایتی ریشم کے تھان اور ایسے ہی بے شمار فارن آئٹمز لایا ہے۔

خالد دروازے کے باہر کھڑا دور تک نظریں دوڑا رہا تھا۔ محلے کے تمام گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے کھل گئے تھے۔ عورتیں جھانک کر دیکھ رہی تھیں۔ مرد باہر نکل آئے تھے۔ خالد کو بھائی یا بیٹا کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ وہ قریب آکر سلام کر رہا تھا ان سے مصافحہ کر رہا تھا۔ بار بار اپنے گھر کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک کسی نے اسے اندر نہیں بلایا تھا۔ ایک محلے دار نے پوچھا۔ "اتنے عرصے تک کہاں تھے؟ سامان دیکھ کر پتہ چلتا ہے' دبئی سے آرہے ہو۔"

دوسرے نے کہا۔ "تمہارے پیچھے طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں' کوئی کہتا تھا تم ایسے ہو کوئی کہہ رہا تھا تم ویسے ہو۔"

تیسرے نے کہا۔ "لوگوں کو تو باتیں بنانے سے مطلب ہے۔"

ایک جوان نے کہا۔ "خالد بھائی! کوئی کہہ رہا تھا۔ پتا نہیں کون کہہ رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں ہے مگر کوئی کہہ رہا تھا تم جیل میں ہو۔ کہیں سزا بھگت رہے ہو۔"

دوسرے جوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ "جیل کو عرفِ عام میں سسرال کہا جاتا ہے۔ اگر ہمارے خالد بھائی سسرال سے ٹرک بھر کر جہیز لائے ہیں تو ہمیں بھی ایسا ہی سسرال پسند ہے۔"

اس بات پر سب دل کھول کر قہقہے لگانے لگے۔ ٹرک ڈرائیور نے آکر کہا۔ "ہمیں جلدی فارغ کرو۔ تمام سامان اندر پہنچا دیا ہے۔ یہ فریج دروازے سے اونچا ہے۔ اندر نہیں جائے گا۔ اس کا کیا کریں؟"

پڑوسی نے کہا۔ "اسے کسی طرح تو اندر لے جانا ہوگا۔"

"مگر یہ کیسے جائے گا؟"

بھابی جان نے دروازے پر آکر کہا۔ "پچھلا دروازہ کافی بڑا ہے۔ فریج کو گندی گلی سے لانا ہوا۔"

"ہاں گندی گلی............" ایک نے تائید کی۔

دوسرے نے کہا۔ "گلی تنگ ہے۔ ٹرک وہاں سے گزر نہیں سکے گا۔"

خالد نے کہا "کوئی بات نہیں۔ ہم اسے سوزوکی میں لے کر جائیں گے۔"

اس نے ٹرک والے کو کرایہ دے کر فارغ کر دیا۔ محلے کا ایک جوان سوزوکی لینے چلا گیا۔ باقی محلے کے لوگوں نے خالد کو گھیر رکھا تھا۔ اس سے اپنائیت کا اظہار کر رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کون سا طلسمی چراغ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔ اس ٹرک میں کم از کم پچاس ہزار روپے کا سامان آیا ہوگا۔ اتنی بڑی خریداری اسی وقت ممکن ہے جب خریدار لاکھوں روپے کا مالک ہو اور لاکھوں روپے یا تو باہر جا کر کمائے جاتے ہیں یا کالے دھندوں سے حاصل کئے جاتے ہیں۔

یہ بات پیٹھ پیچھے کہی جاتی ہے کہ فلاں نے راتوں رات لاکھوں کمائے ہیں۔ سالا چور ہے۔ اسمگلر ہے' غلط دھندے کرتا ہے لیکن یہ باتیں کوئی خالد کے منہ پر نہیں کر سکتا تھا۔ ہمارے ہاں جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا رواج ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا وہ خالد کو منہ کی مروت اور جبری عزت دے رہے تھے۔ اپنی عادت سے مجبور

اپنے خاندان کی ہسٹری بیان کرچکی ہیں اور میں ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ آپ کی بہن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر کبھی دلچسپی کا اندیشہ ہوا تو میں خود زہر کھا کے مرجاؤں گا۔"

وہ غصے سے چیخ کر بولیں۔ "کیا کہا تم نے؟ کیا میری بہن ایسی گئی گزری ہے؟ کیا وہ ثمینہ سے کسی طرح کم ہے؟ آنے دو تمہارے بھائی کو۔ آج فیصلہ ہو جائے گا۔ ہمارے پڑوسی نے فون پر اطلاع دے دی ہے۔ تمہارے دونوں بھائی آتے ہی ہوں گے۔"

"کیا ان کے انتظار میں باہر کھڑا رہوں؟"

"یہ تمہارے باپ کا گھر ہے' ہم تمہیں کیسے روک سکتے ہیں مگر میرے میکے کی شرافت اور عزت کا خیال کرو۔ آئندہ سامنے سے نہ آؤ۔ گندی گلی سے چھپ کر آجایا کرو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے پردہ برابر کردیا۔ وہ پلٹ کر سامنے والے برآمدے سے اتر گیا۔ سر جھکائے جانے لگا۔ شاید محلے کی عورتیں ابھی تک بالکونی اور کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔ وہ سر اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہاں کھڑے ہوئے لوگوں سے انجان بن کر گزر رہا تھا۔ اس نے بوجھل قدموں سے سامنے والی صاف ستھری گلی کو پار کیا پھر ایک طرف سے گھوم کر گندی گلی کے سرے پر آگیا۔

شہر کے کئی علاقوں میں قطار اندر قطار مکانات ہوتے ہیں۔ ہر قطار کے سامنے والی گلی صاف ستھری ہوتی ہے۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا یا سگریٹ کا ایک ٹوٹا بھی شاید ہی کبھی دیکھنے میں آتا ہے۔ کوئی اپنے گھر کے سامنے ایک تنکا نہیں پھینکتا۔ سب گھر کے پیچھے پھینکتے ہیں۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آدمی اپنے سامنے گندگی برداشت نہیں کرتا' پیچھے کرلیتا ہے کیونکہ وہ پیچھے دکھائی نہیں دیتی۔

ہر مکان کے پچھلے حصے میں جو گلی ہوتی ہے۔ وہ غلاظت کا ڈھیر ہوتی ہے۔ یہاں میونسپلٹی کے خاکروب الیکشن کے دور میں روز صفائی کے لئے آتے ہیں ورنہ انتخابی نتائج کا اعلان ہونے کے بعد ماہ' دو ماہ یا چھ ماہ بعد کوئی صفائی کے لئے آتا ہے۔ خالد نے گلی کے سرے پر پہنچتے ہی ناک پر رومال رکھ لیا۔ پہلے وہ اس گلی سے گزرنے کا عادی تھا۔ دو برس میں عادت بدل گئی تھی۔ کہتے ہیں' محبت کرنے والے کانٹوں پر چلتے ہیں۔

آئندہ اسے ثمینہ کی خاطر اس گندی گلی سے گزرتے رہنا تھا۔

وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ کہیں ٹین کے پچکے ہوئے ڈبے اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں پڑی تھیں۔ کہیں آلو اور انڈوں کے چھلکے اور سڑے ہوئے ٹماٹر راستہ روک رہے تھے۔ وہ چند قدم جانے کے بعد رک گیا۔ ایک خاتون نے دروازہ کھول کر اپنے گھر کا کچرا گلی میں پھینکا تھا۔ کچرے کا کاغذی تھیلا اس کے قریب آکر ایسے گرا جیسے بم آکر پھٹ پڑا ہو۔ پھٹے ہوئے تھیلے میں سے گرد کا منی طوفان سا اٹھا۔ وہ ناک پر رومال رکھنے کے باوجود کھانسنے لگا۔ پڑوسن ہنسنے لگی۔ وہ گرد اس کے گھر میں داخل ہو رہی تھی۔ خالد کھانستا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ آگے ایک اور دروازے سے حملہ ہوا۔ ایک کاغذی تھیلا گلی کے درمیان آکر گرا۔ تھیلا پھٹنے سے سمندری جھینگوں کے چھلکے دور تک پھیل گئے۔ اس کی بساند ناقابلِ برداشت تھی' وہ بو ہوا کے دوش پر آس پاس کے گھروں میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک گھر کے دروازے پر ننھے بچے کے غلیظ پوتڑے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ایسے پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا جیسے پُل صراط پار کر رہا ہو۔ آخر وہ اپنے گھر کے پچھلے دروازے پر پہنچ ہی گیا۔

اسے اپنے ابا کی کھانسی سنائی دی۔ وہ دروازے کے قریب ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانستے کھانستے جھک رہے تھے اور جھکتے جھکتے کھانس رہے تھے۔ بڑھاپے نے انہیں پہلے ہی نِڈھال کر دیا تھا۔ کھانسی اور جھکا رہی تھی' اب وہ اسّی پچاسی برس کے ہوگئے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بوڑھی آنکھیں میچ کر بولے۔ "خالد! تم ہو؟ بڑی دلہن کہہ رہی تھی' تم واپس آگئے ہو۔"

وہ پاس آکر سلام کرکے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں ثمینہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ باپ نے کہا۔ "نظریں ڈھونڈتی رہتی ہیں' بڑی مشکلوں سے دیدار ہوتا ہے۔"

بیٹے نے چونک کر پوچھا۔ "جی ابا جان! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میری نظریں تمہیں ڈھونڈتی رہتی تھیں۔ آج تمہارا دیدار ہو ہی گیا۔ سچ بتاؤ بیٹے! کیا واقعی تم جیل میں تھے؟"

"ابا جان آپ اس موضوع پر بات نہ کریں۔"

"کیوں نہ کروں؟ کیا تم مجھ سے باپ ہونے کا حق چھین لینا چاہتے ہو؟"

آدمی بوڑھا اور لاچار ہو جائے تو پھر باپ نہیں رہتا۔ صرف والد صاحب رہ جاتا

ہے۔ باپ اسے کہتے ہیں جو خون کے ایک قطرے سے اولاد کو زندگی دیتا ہے۔ پھر روٹی کپڑا اور تعلیم دیتا ہے۔ سر چھپانے کے لئے گھر' عزت بنانے کے لئے شریفانہ ماحول اور فخر کرنے کے لئے شاندار ماضی دیتا ہے۔

باپ ایک عہدہ ہے۔ والد صاحب ایک خطاب ہے۔ جس طرح کوئی خطاب حاصل کرنے کے بعد مرتے دم تک خان بہادر کہلاتا ہے۔ اسی طرح ایک باپ مرتے دم تک والد صاحب رہتا ہے لیکن وہ باپ نہیں رہتا۔ ملازمت چھوٹتے ہی کاروبار ڈوبتے ہی' اولاد کا محتاج ہوتے ہی وہ باپ کے عہدے سے گر جاتا ہے۔ کمانے والے بیٹے اس کے باپ بن جاتے ہیں۔ اسے بیڈ روم کے پلنگ سے اٹھا کر چارپائی پر ڈالتے ہیں اور گھر کے پچھلے صحن میں کھانسنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اگر والد صاحب کا خطاب باقی نہ رہتا تو اسے گندی گلی میں ڈال دیتے۔

اسّی پچاسی برس کے صد یار خان باپ کے عہدے سے گرنے کے باوجود کماؤ بیٹوں سے پوچھتے رہتے تھے۔ "کیا مجھ سے باپ ہونے کا حق چھین رہے ہو گھر میں کوئی تقریب ہوتی ہے' پتا نہیں چلتا کس سلسلے میں تقریب ہو رہی ہے۔ پوتے پوتیوں کے رشتے طے ہوتے ہیں کوئی مجھے نہیں پوچھتا۔ رشتہ کہاں ہو رہا ہے۔ کس خاندان میں ہو رہا ہے۔ پوچھو تو بہوئیں سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ مانا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ بات کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر سمجھائی تو جاسکتی ہے۔ میری بزرگی کا مان رکھنے کے لئے مجھ سے مشورہ تو لیا جاسکتا ہے۔ میری کوئی بات مان کر مجھے یقین دلایا جاسکتا ہے کہ باپ کا عہدہ ابھی برقرار ہے۔ ارے کمبختو مجھ سے باپ ہونے کا حق کیوں چھین رہے ہو؟"

خالد نے باپ کے بوڑھے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "وہ دور گزر چکا ہے' جب گھر کے ہر فرد کو آپ کی ضرورت تھی۔ آج کسی کو ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ گھر کے ہر بڑے اور بچے کی توجہ کے محتاج ہیں اور جو محتاج ہوتا ہے ابا جان! وہ باپ نہیں ہوتا' حاکم نہیں ہوتا' اپنے حقوق نہیں منوا سکتا۔"

بڑھاپا بحث نہ کرسکا۔ جواب میں کھانسنے لگا۔ مکان کے سامنے والے حصے میں موٹر سائیکلوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دس برس کی ایک پوتی نے کہا۔ "دادا جان! ابّو اور چچا جان آگئے ہیں۔"

پھر اس بچی نے خالد سے کہا۔ "چچا! ابّو نے نئی موٹر سائیکل خریدی ہے۔ ہمیں گاڑی پر بٹھا کر کلفٹن لے گئے تھے۔ مجھے تو موٹر سائیکل پر بہت ڈر لگتا ہے۔"

خالد نے اسے پاس بلا کر چومتے ہوئے کہا۔ "میں اپنی صائمہ کے لئے کار خرید کر لاؤں گا۔"

"پھر تو بڑا مزہ آئے گا چچا! میں اگلی سیٹ پر بیٹھوں گی۔ ابّو تو کار خرید نہیں سکتے۔ آپ کے پاس ابو سے زیادہ پیسے ہیں؟"

بھابی جان نے اپنے کمرے سے ڈانٹ کر کہا۔ "صائمہ! بکواس نہ کرو۔ تمہارے ابّو حلال کی کمائی لاتے ہیں اور حلال کی کمائی تھوڑی ہوتی ہے۔ چلو ادھر آؤ۔"

وہ سہم کر خالد سے الگ ہوگئی۔ سر جھکا کر ماں کے پاس جانے لگی۔ خالد نے بڑے بھائی جان کی آواز سنی' وہ کہہ رہے تھے۔ "بیگم یہ کیا تک ہے۔ دفتر میں دنیا بھر کا کام پڑا ہے۔ سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی اور تم نے فون کرکے گھر بلالیا۔ خالد آیا ہے تو کیا ہوا کوئی پیغمبر تو نہیں آیا ہے۔"

خالد نے چھوٹے بھائی جان کی آواز سنی' وہ اپنی بیگم سے کہہ رہے تھے۔ "اچھا تو یہ سامان لایا ہے۔"

منجھلی بھابی کی آواز سنائی دی۔ "ابی یہ تو کچھ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ سامان دوسرے کمرے میں ہے۔"

تھوڑی دیر بعد دوسرے کمرے سے بڑے بھائی جان کی آواز آئی۔ "غضب خدا کا! اتنا سارا سامان؟ اس بدمعاش نے کسی بنک میں ڈاکا تو نہیں ڈالا ہے؟"

بیگم نے کہا۔ "آہستہ بولئے۔ ڈاکا آپ نے تو نہیں ڈالا۔ بھلا ہمیں کس کا ڈر ہو سکتا ہے۔"

"پولیس ہمارے گھر آسکتی ہے۔" بڑے بھائی جان نے کہا۔

"تم عورتوں کی عقل ماری گئی ہے قیمتی اور نمائشی سامان دیکھ کر صبر نہ کرسکیں۔ ہمارا انتظار نہ کرسکیں۔ سارا سامان گھر میں لے آئیں۔ پولیس نے چھاپا مارا تو کیا ہوگا؟" چھوٹے بھائی جان نے گرہ لگائی۔

بھابی جان کی آواز آئی۔ وہ پریشان ہو کر کہہ رہی تھیں۔ "ہم نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ چوری کا ہو سکتا ہے۔ اب کیا ہوگا؟"

چھوٹے بھائی جان نے گرج کر پوچھا۔ "کہاں ہے وہ لفنگا' بد معاش؟"
بیگم نے کہا۔ "وہ ابا جان کے پاس صحن میں ہے۔ ہم نے اسے گھر میں نہیں بلایا ہے۔"

پھر گرج کر کہا۔ "وہ صحن ہمارے گھر میں ہی ہے۔ اسے یہاں بلاؤ۔"

خالد چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ منجھلی بھابی نے آکر کہا۔ "اے میاں' چلو تمہاری پیشی ہے۔"

وہ بھابی کے پیچھے چلتا ہوا ایک کمرے میں آیا۔ بھابی جان صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑے بھائی جان اور چھوٹے بھائی جان ایک طرف یوں کھڑے ہوئے تھے جیسے اسے دیکھتے ہی گولی مارنے والے ہوں۔ بڑے بھائی نے اسے دیکھتے ہی غصے سے پوچھا۔ "تم پھر ہمیں ذلیل کرنے آ گئے ہو؟"

وہ آرام سے بولا۔ "میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

چھوٹے بھائی جان نے فرش پر پاؤں مارتے ہوئے پوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"یہ میرے باپ کا مکان ہے۔"

"کیا تمہیں باپ کی اور خاندان کی عزت کا کچھ خیال ہے؟"

"عزت بڑھانے کے لئے ہی اتنا سامان لایا ہوں۔"

"یہ سامان کہاں سے لائے ہو؟"

خالد نے چپ چاپ ایک اٹیچی کے پاس آکر جیب سے چابیاں نکالیں' اسے ایک چابی سے کھولا۔ اس میں سے ایک فائل نکالی۔ اپنے بڑے بھائی کے پاس آیا۔ پھر وہ فائل دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں ہر سامان کی پکی رسید موجود ہے۔ میں سامان دکھاتا جارہا ہوں آپ ایک ایک رسید دیکھتے جائیں۔ یہ چودہ ہزار کا فریج ہے۔ یہ بارہ ہزار کا وی سی آر اور بارہ ہزار کا رنگین ٹی وی ہے۔ چھ ہزار کی واشنگ مشین ہے..........."

دونوں بھائی فائل کھولے کھڑے تھے۔ ایک ایک رسید پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔
خالد ایک ایک اٹیچی اور کارٹن کھول رہا تھا۔ ان میں سے ایسے ایسے سوٹ کپڑے اور قیمتی ساریاں نکل رہی تھیں جنہیں اس گھر کی عورتوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں

دیکھا تھا۔ ایسے خوبصورت کھلونے اور ویڈیو گیمز تھے جنہیں بچے بڑی بڑی دکانوں کے شوکیسوں میں دیکھتے تھے اور جنہیں ان کے والد خریدنے جاتے تو ایک ہی کھلونے میں ایک ماہ کی تنخواہ ختم ہو جاتی۔

اس گھر میں دو برس کی بچی سے لے کر بیس برس تک کی بچیاں اور بچے تھے۔ وہ سب دوسرے کمرے سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہے تھے اور للچا رہے تھے۔ خالد نے ایک اور اٹیچی کھولی۔ اس میں سے زیورات کا ایک ڈبا نکال کر سامنے رکھنے لگا۔ دونوں بھابیاں پہلے ہی قیمتی کپڑے اور ساریاں دیکھ کر کھل رہی تھیں۔ سونے کے زیورات دیکھ کر جیسے سانس لینا بھول گئیں۔ ایسے ایسے نئے اور عمدہ ڈیزائن کے زیورات تھے کہ ان پر آنکھیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ ابھی ایک کو دیکھنے سے جی نہیں بھرتا تھا کہ دوسرا ڈبا کھل جاتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کون سا زیور پسند کریں اور کسے رد کریں۔ سونے کی ایک کیل بھی ایسی نہ تھی جسے چھوڑنے کو جی چاہتا ہو۔

بھابی جان زیورات کا پہلا ڈبا دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ یکے بعد دیگرے آخری ڈبا دیکھنے تک وہ کھڑی نہ رہ سکیں' دھپ سے پرانے صوفے پر گر پڑیں۔ منجھلی بھابی کا سر چکرا رہا تھا انہوں نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "یہ........... یہ کتنے کے ہوں گے؟"

ان کے شوہر رسیدیں دیکھ رہے تھے اور کیلکولیٹر میں رقم جوڑتے جا رہے تھے' انہوں نے کہا۔ "تمام زیورات بیالیس ہزار سات سو روپے کے ہیں اور یہ دوسرا تمام سامان اڑتالیس ہزار کا ہے۔ کل رقم نوے ہزار سات سو روپے' یوں سمجھو' یہ ایک لاکھ روپے کی خریداری ہے۔ خدا کی قسم آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں آرہا ہے۔ پکی رسیدیں موجود ہیں' کسی پر چوری کا الزام نہیں آسکتا مگر اتنی بڑی رقم تمہارے پاس آئی کہاں سے؟"

خالد نے کہا۔ "میں نے کبھی آپ لوگوں کی آمدنی نہیں پوچھی۔ آپ بھی نہ پوچھیں۔"

"ہم سیدھی سادی ملازمت کرتے ہیں۔ ہماری بندھی بندھائی تنخواہ ہے۔ دنیا والے ہم پر نہیں' تم پر شبہ کریں گے۔"

بھابی جان نے کہا۔ "دنیا والے کس پر شبہ نہیں کرتے۔ یہ زیادہ سے زیادہ

کمانے کا دور ہے۔ میں نے ایک نہیں' ہزار بار کہا۔ نوکری کے ساتھ ساتھ کچھ کریں۔ بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں۔ دور کیوں جاتے ہیں' اپنے محلے میں دیکھ لیجئے۔ ایسا کون سا گھر ہے جہاں اوپری آمدنی نہیں آرہی ہے۔ آج ہمارے گھر میں کچھ آیا ہے تو دنیا والے کیا کہیں گے' کس کی مجال ہے۔ ہر سامان کی پکی رسید ہے' آج تو محلے والوں کو نیند نہیں آئے گی۔ آج یہاں سے وہاں تک کوئی ہماری حیثیت کا آدمی نہیں ہے' اوپری آمدنی اس لئے ہوتی ہے کہ کوئی ہماری برابری نہ کرسکے۔"

"بیگم! تم بات کو کہاں سے کہاں لے جارہی ہو؟ ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ناکارہ نالائق لڑکا جو کبھی چار پیسے کمانا نہیں جانتا تھا۔ آج لکھ پتی کیسے بن گیا۔ آخر یہ گھر سے نکل کر کہاں گیا تھا۔ اتنے عرصے تک کیا کرتا رہا تھا؟"

خالد نے دونوں بھائیوں کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "آپ لوگوں نے مجھے کچرا سمجھ کر باہر پھینک دیا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں گندگی میں پھینکا جانے والا کچرا کہاں جاتا ہے؟ ظاہر ہے اسے خاکروب سمیٹ کر لے جاتے ہیں' یعنی کچرا کبھی اچھے ہاتھوں میں نہیں جاتا۔ میں بھی برے ہاتھوں میں جاچکا ہوں۔"

سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ اس نے کہا۔ "آپ میری بات نہ کریں' اپنی بات کریں۔ جب میں اس گھر میں تھا تو آپ لوگوں کے دو پرابلم تھے۔ ایک میری بے روزگاری' دوسری میرے پیار کی دیوانگی۔ میں اور ثمینہ بچپن سے ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن بھابی جان نے صاف انکار کردیا تھا۔ یہ اپنی بہن کا رشتہ نہیں دینا چاہتی تھیں اور آپ لوگوں نے پیش گوئی کی تھی کہ میں کبھی ڈھنگ کا کام نہیں کرسکوں گا۔ اگر شادی ہوئی تو بیوی بچوں کو بھوکا ماروں گا۔ آج میں نے آپ کے دونوں مسئلے حل کردیئے۔ آج کے دور میں ڈھنگ کا کام اسے کہتے ہیں جس سے لاکھوں روپے ملتے ہوں۔ یہ تمام سامان اس بات کا ثبوت ہے کہ میں ثمینہ کو کبھی بھوکا نہیں رکھوں گا۔"

بھابی جان نے کہا۔ "بار بار میری بہن کا نام نہ لو' دنیا ہنستی ہے' تمہارا کچھ نہیں جاتا۔ میری بہن بدنام ہوتی ہے۔"

خالد نے کہا۔ "شادی میں جتنی دیر ہوگی' بدنامی بڑھتی جائے گی۔"

بھائی جان نے غصے سے پوچھا۔ "تم اس کا نام کیوں لیتے ہو بدنامی کا سبب کیوں

بنتے ہو؟"

"آپ لوگ بدنامی کا موقع کیوں دیتے ہیں۔ میں نے ثمینہ کے لئے آپ لوگوں سے گالیاں سنی ہیں۔ آپ نے مجھے مارا بھی ہے۔ میں نے چپ چاپ مار کھائی۔ آپ نے مجھے ناکارہ کہا میں پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر لے آیا۔ اب بھی آزمانے کے لئے کچھ رہ گیا ہے تو آزما لیجئے مگر ہماری بدنامی کو نیک نامی میں بدل دیجئے۔"

بھائی جان اور بھابی جان نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے کہا۔ "دیکھو خالد! اصل بات یہ ہے کہ اس معاملے میں دیر ہوچکی ہے۔ ہم نے ایک اعلیٰ خاندان کے لڑکے سے ثمینہ کی منگنی کردی ہے۔"

خالد کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ یوں لرز گیا جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ اس نے دانت پر دانت جمالئے۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ سامنے والوں کو گھور کر دیکھنے لگا۔ ایک بھائی نے سخت لہجے میں کہا۔ "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کوئی تمہاری دھونس تو نہیں ہے۔ ہم نے جہاں مناسب سمجھا' وہاں اس کا رشتہ طے کردیا۔"

خالد آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک لکڑی کے چھوٹے سے بکس کے پاس آیا۔ وہ بکس گٹار بکس تھا۔ اس میں موسیقی کا ایک ساز گٹار رکھا جاتا تھا۔ اس نے کہا۔ "جس زبان سے رشتہ کیا گیا ہے' اسی زبان سے توڑ دیجئے۔"

انہوں نے کہا۔ "ہم شریف لوگ ہیں' زبان دے کر نہیں پھرتے' چھ ماہ بعد شادی کی تاریخ مقرر ہوچکی ہے۔"

خالد نے کہا۔ "میں نے ایک ایک اٹیچی' ایک ایک کارٹن اور ایک ایک بکس کھول کر ہر وہ چیز دکھائی ہے جس کے ذریعے آپ لوگوں کا دل جیت کر ثمینہ کو جیت سکتا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ انکار نہیں کریں گے لیکن کر رہے ہیں۔ اب میں آخری چیز دکھا رہا ہوں' اسے دیکھ کر آپ شریف' حضرات زبان سے پھر جائیں گے اور جو رشتہ کیا ہے' اسے یقیناً توڑ دیں گے۔"

اس نے جیب سے ایک چابی نکالی۔ سب کے سب تجسس سے گٹار بکس کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اب تک جو قیمتی سامان دیکھا تھا' اس سے بھی زیادہ قیمتی چیز دیکھنے کی توقع کررہے تھے۔ دونوں بھائیوں نے سوچا۔ وہ قیمتی زیورات دکھا چکا ہے' اب شاید بڑے بڑے نوٹوں کی بڑی بڑی گڈیاں نکالے گا۔

وہ بکس کھل گیا۔ خالد نے دونوں ہاتھ بکس میں ڈالے جب وہ ہاتھ باہر آئے تو عورتیں خوف سے چیخ اٹھیں۔ دونوں بھائی سہم کر دیوار سے جا لگے' خالد کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اس کا چہرہ ایک قصائی کی طرح بے رحم ہو گیا تھا۔ وہ کلاشنکوف میں تیس گولیوں کا میگزین لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "جب میں ڈھنگ کا کام نہیں کرپاتا تو یہ کرتی ہے۔ نہ کو ہاں میں بدل دیتی ہے۔ نہ بدل سکے تو زندگی کو موت میں بدل دیتی ہے۔ باقی وہی ہوتا ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔"

اس نے کھٹاک کی آواز کے ساتھ گن سیدھی کرلی۔

☆======☆======☆

صدیار خان کو زمانے کی بڑی فکر تھی۔ کوئی ان کی بات سنے یا نہ سنے' وہ سناتے رہتے تھے۔ "ہمارے بچپن میں خالص گھی پانچ آنے سیر تھا۔ آج پچاس روپے سیر ہے۔ پہلے ایک پیسہ بڑی محنت اور جاں فشانی سے ملتا تھا۔ آج لاکھوں روپے ایک رات میں مل جاتے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کہ تمہارے پاس دولت کہاں سے آرہی ہے۔ جب شہر کا کوتوال اور انصاف کرنے والا قاضی حرام کی دولت میں شریک ہوں تو پھر پوچھنے کی جرأت کون کرسکتا ہے؟"

اگر خریدنے کی قوت کم ہوگی تو چیز کی قیمت بھی کم ہوتی جائے گی۔ اگر پیسہ آسانی سے حاصل ہوگا جیب میں رقم زیادہ ہوگی تو چیزوں کے دام بڑھتے جائیں گے بلکہ بڑھتے جارہے ہیں۔ یہ بات موٹی سی عقل سے بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ لوگ خرید سکتے ہیں اسی لئے مہنگائی بڑھتی ہے۔

صدیار خان نے اب سے پچیس برس پہلے اپنی بڑی بیٹی آمنہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی تھی۔ کپڑوں اور پکانے کھانے کے برتنوں سے لے کر الماری اور فرنیچر تک جہیز میں دیا تھا۔ اتنی دھوم دھام اور کھانے کے باوجود صرف دس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ٹی وی اور الیکٹرونک کا سامان نہیں تھا۔ جاپانی موٹر سائیکلوں کی بھرمار نہیں تھی۔ ان دنوں داماد بائیسکل کا مطالبہ کرتے تھے جو ڈھائی تین سو روپے تک مل جاتی تھی۔

ان کی بیٹی آمنہ نے بی اے کیا تھا۔ داماد ظہیرالدین ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ شادی کے بعد آمنہ نے پوچھا۔ "کیوں جی! آپ نے ابا جان سے سائیکل کا مطالبہ کیوں

کیا؟"

ظہیر نے کہا۔ "کالج جانے کے لئے بس اسٹاپ پر گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ اب سائیکل پر آرام سے جایا کروں گا۔"

"آپ صرف تعلیم یافتہ نہیں بلکہ تعلیم بھی دیتے ہیں میری بات کا برا نہ مانیں کیا سسرال سے اپنی ضرورت پوری کرنا مناسب ہے؟"

"ہرگز مناسب نہیں ہے لیکن میری مجبوری تھی۔ میں نے اپنی محنت سے جو رقم جمع کی تھی' وہ شادی میں خرچ ہوگئی۔ سائیکل کے لئے رقم نہ بچاسکا۔"

"آپ نے شادی میں فضول خرچی کی' بھلا بینڈ باجا کیا ضروری تھا؟"

"بارات میں باجا نہ ہو تو وہ خاموش ماتمی جلوس لگتی ہے اور بینڈ باجے میں تو صرف ستر روپے خرچ ہوئے تھے۔"

"یعنی آپ نے ستر روپے کی بچت نہیں کی۔ ویسے کی دعوت میں بکرے کا گوشت بھی تھا اور مرغی کا بھی۔ جبکہ ایک ہی سالن سے مہمانوں کا پیٹ بھر سکتا تھا۔"

ظہیر نے تائید کی۔ "ہاں' پہلے خیال نہیں آیا۔ شادی کرنے اور تمہیں پالینے کی خوشی میں فضول خرچی ہوگئی۔"

"ہمیں غور کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ آپ سادگی سے نکاح پڑھوانے آتے تب بھی میں مل جاتی۔"

انہوں نے تجزیہ کیا۔ جو کچھ ہوا' اس کے اسباب کا جائزہ لیا۔ پھر بات سمجھ میں آئی کہ ہم شعوری اور غیر شعوری طور پر نمائش کے عادی ہیں۔ ناچنے گانے اور باجا بجانے کی خوشی گھر کی حد تک مناسب ہے لیکن راستے میں بینڈ بجاتے اور بھنگڑا ڈالتے ہوئے جانا محض نمائش ہے۔ ساری دنیا کو یہ دکھایا جائے کہ ہم کسی کی بیٹی کو باقاعدہ اٹھوانے جارہے ہیں۔

ظہیر نے کہا۔ "میری جان پہچان والے راستے میں ملتے ہیں تو پوچھتے ہیں۔ سائیکل کتنے میں لی؟ یہ تو بالکل نئی ہے۔ میں مسکراتے ہوئے جواب دیتا ہوں' یہ سسرال سے ملی ہے۔ ایسا کہے ہوئے ہم فخر محسوس کرتے ہیں کہ کسی کی صرف بیٹی نہیں لی' اپنی ضرورت کا ہر سامان بھی لیا ہے۔ اب یہ بات چبھ رہی ہے کالج کے تمام اسٹوڈنٹس کو میری سسرالی سائیکل کا علم ہے۔ گویا میں نے نادانستگی میں اپنے شاگردوں

کو بیوی کے ساتھ جہیز لینے کا درس دیا ہے۔"

آمنہ اور ظہیر تعلیم یافتہ تھے۔ کسی بھی غلطی پر خود اپنا محاسبہ کر سکتے تھے لیکن محاسبہ کرنے کے باوجود آدمی اپنے حالات کا غلام ہوتا ہے اور اپنے ماحول سے متا ہوتا ہے۔ ظہیر کے ایک بھائی کمشنر تھے' دوسرے بھائی ڈی ایس پی تھے۔ وہ سرکار بنگلوں میں رہتے تھے' ایک کے پاس کار تھی' دوسرے کے پاس جیپ تھی۔ ظہیر سائیکل پر بیٹھ کر ان سے ملنے آتا تو وہ اپنی انسلٹ محسوس کرتے تھے۔ بڑے بڑے لوگ ان سے ملنے قیمتی کاروں میں آتے تھے۔ وہ کاریں بنگلے کے سامنے کھڑی رہتی تھیں۔ ان کے درمیان سائیکل یوں لگتی تھی جیسے کوئی بھیک مانگنے والا آگیا ہو۔

دونوں بھائیوں نے اور بھابیوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ "ظہیر میاں! کچھ ہماری عزت کا خیال کرو۔ آئندہ بنگلے کے سامنے سے نہ آؤ۔ پچھلے راستے سے آیا کرو۔"

اس روز معلوم ہوا کہ بنگلوں کے پیچھے بھی گندی گلی ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی کیونکہ کچرا وہاں ٹھہرنے نہیں پاتا۔ کچرا رشتے دار ادھر سے چھپ کر آتے ہیں پھر سلام دعا کے بعد چلے جاتے ہیں۔

وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا۔ پتا نہیں لوگوں کے پاس دولت کہاں سے آرہی تھی۔ اب کالج میں پڑھنے والے طلبا و طالبات کاروں اور موٹر سائیکلوں پر آنے لگے تھے۔ پروفیسر ظہیر الدین اسی پرانی سائیکل پر آتے تھے۔ یہاں محض کمتری کا مسئلہ نہیں تھا۔ سوال یہ تھا کہ ایک استاد اپنے شاگردوں پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ استاد محض تعلیمی صلاحیتوں سے برتر نہیں ہوتا۔ تعلیم کو شاگردوں کے دماغ میں نقش کرنے کے لئے اپنی شخصیت اور ظاہری رکھ رکھاؤ کو بھی پُراثر بنانا پڑتا ہے۔ آج تعلیمی معیار کے پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کاروں میں آنے والے شاگرد سائیکل پر آنے والے استاد کو کمتر سمجھتے ہیں۔

ظہیر نے کہا۔ "آمنہ! ہم کبھی کار نہیں خرید سکیں گے لیکن قسطوں میں موٹر سائیکل خرید سکتے ہیں۔"

آمنہ نے کہا۔ "ہماری دو بیٹیاں ہیں۔ اگر ہم قسطیں ادا کریں گے تو دو چار برس تک ان کے جہیز کے لئے کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہارے ابا کہتے ہیں تمہیں اچھا خاصا جہیز دینے کے باوجود صرف دس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ آج تو دس ہزار میں باراتیوں کا کھانا بھی نہیں ہوتا۔"

وہ بولی۔ "ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ بیٹے کی شادی کریں گے تو بہو کے گھر سے ایک پیسے کا جہیز نہیں لائیں گے مگر کوئی داماد ہماری بیٹی کے لئے بھی تو ایسا سوچے۔ یہ جیسے جیسے شادی کی عمر کو پہنچ رہی ہیں' میری نیند اُڑتی جارہی ہے۔"

"زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ میں نے تمہارے ابا سے ڈھائی سو کی سائیکل کا مطالبہ کیا تھا آج لڑکے چودہ ہزار کی ہنڈا مانگتے ہیں۔ پہلے بیٹیوں کو جہیز میں گھر گرہستی کا سامان دیا جاتا تھا آج ٹی وی اور وی سی آر کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ جب تک یہ دو چیزیں نہ ہوں' جہیز ہلکا لگتا ہے۔"

آمنہ نے پوچھا۔ "آخر یہ بیٹیوں والے جہیز کے لئے اتنی بڑی رقمیں کہاں سے لاتے ہیں؟ ہمارا پڑوسی چپل کا کارخانہ چلاتا ہے۔ عید بقر عید کے موقع پر کام خوب چلتا ہے۔ باقی دس مہینے وہ آمدنی کو روتا رہتا ہے لیکن جب اس نے بیٹی کی شادی کی تو اس کے گھر والی فخر سے کہہ رہی تھی کہ انہوں نے اسی ہزار روپے کا جہیز دیا ہے۔ باراتیوں کو بیس ہزار روپے کا کھانا کھلایا ہے۔ سال کے صرف دو مہینے کمائی کرنے والوں کے پاس لاکھوں کہاں سے آجاتے ہیں۔"

"فی زمانہ یہ سب سے اہم سوال ہے کہ لوگوں کے پاس بڑی بڑی رقمیں کہاں سے آجاتی ہیں؟ پھر یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ ایسی رقمیں ہمیں کیوں نہیں ملتیں؟"
ظہیر نے کہا۔ "ہمیں سراغ لگانا چاہئے۔"

"سراغ کیسے لگائیں گے اور کیوں لگائیں گے؟"

"ایسا ہر دور میں ہوتا ہے۔ ایک وقت تھا جب کمانے کھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ جسمانی قوت ضروری تھی۔ پھر ہماری دنیا میں علم آیا تو ذہنی صلاحیتیں آمدنی کا ذریعہ بن گئیں۔ جب بھی مہنگائی بڑھتی ہے' ہم سوچتے ہیں' آمدنی میں کیسے اضافہ کریں۔ اس کے لئے آپ نے کالج سے آنے کے بعد بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا۔ اس طرح ہم حالات کا سامنا کررہے ہیں لیکن بیٹیوں کو کس طرح وداع کریں گے؟ اس کے لئے ہمیں سراغ لگانا ہوگا کہ دوسروں کے پاس بڑی بڑی رقمیں کہاں

سے آتی ہیں؟"

دوسرے دن سے آمنہ پڑوس کے ہاں زیادہ آنے جانے لگی۔ ظہیر نے پڑو
سے دوستی کا آغاز کیا۔ علی بابا اور چالیس چوروں کی کہانی میں قاسم کی بیوی کو تجسس
کہ فاقہ کرنے والے علی بابا کے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی؟ اس نے قاسم سے
کہا۔ اپنے بھائی علی بابا کے پاس جاؤ۔ محبت سے پیش آؤ۔ خون کے رشتے کا واسطہ دو۔
بھائی نہ سہی' دوست بن کر معلوم کرو کہ وہ راتوں رات امیر کبیر کیسے بن گیا؟

پڑوسی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ظہیر صاحب! ہم بدنصیبوں کو علی بابا کا خزانہ کہاں
ملے گا۔ البتہ میرے دور کے رشتے کا ایک بھائی ہے۔ بہت بڑا بزنس مین ہے۔ اس کے
پاس ایکسپورٹ لائسنس ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ بھائی رمضان! عمدہ ڈیزائن ک
چپلیں تیار کرو۔ اگر ملک کے باہر تمہارا مال پسند کیا گیا تو تمہارے سارے ولدر دو
ہوجائیں گے۔ بس جی ظہیر صاحب! میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کیا۔ میرا مال
بہت پسند کیا گیا۔ میری بیٹی کی تقدیر سے دولت آنے لگی۔ میں نے اس کی شادی میں
ایک لاکھ سے اوپر خرچ کیے ہیں اور یہ مکان تو دیکھ ہی رہے ہیں۔ اسے توڑ کر کوٹھی
رہا ہوں۔ میں تو کہتا ہوں' یہ سب اللہ کی دین ہے۔ وہ چاہے تو آپ کو بھی دے گا۔"

آمنہ اور ظہیر مایوس ہوگئے بے شک انہیں اللہ پر بھروسا تھا۔ مگر یہ بات سمجھ
میں نہیں آتی تھی کہ اللہ سب کو چھپر پھاڑ کر دے رہا ہے تو سفید پوشی کا بھرم رکھنے
والے شریف اور عزت دار لوگوں کو کیوں نہیں دے رہا ہے؟

آمنہ نے کہا۔ "رمضان کا بھائی اسے سہارا نہ دیتا تو آج اس کے دن نہ پھرتے
آپ کے دو بھائی ہیں۔ وہ ضرورت سے بہت زیادہ کماتے ہیں۔ وہ بھی آپ کو کس
کاروبار سے لگا سکتے ہیں۔"

ظہیر نے ایک دن سائیکل سنبھالی۔ پھر بنگلے کے پچھلے دروازے پر آکر گھنٹ
بجائی۔ گھنٹی سامنے والے دروازے پر ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نے سائیکل کی گھنٹی
بجائے۔ بھابی نے سمجھا دودھ والا آیا ہے۔ دروازہ کھول کر ظہیر کو دیکھا تو منہ بن گیا
بولیں۔ "جب دیکھو' بے وقت آجاتے ہو۔ تمہارے بھائی منسٹر صاحب سے باتیں
کر رہے ہیں۔ معزز خواتین آئی ہوئی ہیں۔ اب میں تمہیں کس کمرے میں بٹھاؤں؟"

"کوئی بات نہیں۔ یہاں درخت کے سائے میں خاصی ٹھنڈک ہے میں باہر ہ

رہوں گا' گھر میں نہیں آؤں گا لیکن بھائی جان سے مل کر جاؤں گا۔"

وہ شام کو پانچ بجے آیا تھا۔ رات کو نو بجے بھائی نے اندر بلایا پھر کہا۔ "جو کہنا ہے'
جلدی کہو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ یہ میرے سونے کا وقت ہے۔"

"بھائی جان! میری تنخواہ میں گزارہ نہیں ہوتا۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا ہوں پھر
بھی مہنگائی مارے ڈالتی ہے۔ لڑکیاں جوان ہو رہی ہیں۔ مجھے کسی ایسے کام سے لگا
دیجئے جس سے آمدنی میں معقول اضافہ ہو۔"

"تم ایک سیدھے سادے پروفیسر ہو۔ ہمیشہ کتابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔ ہماری
دنیا میں کتنی بدمعاشیاں ہوتی ہیں۔ یہ تم سمجھ نہیں پاؤ گے تمہیں کسی بزنس مین کے
ساتھ لگاؤں گا تو تم اس کے ہتھکنڈوں سے بے وقوف بنتے رہو گے۔ وہ مجھ پر احسان
جتائے گا کہ بھائی کی وجہ سے نقصان اٹھا رہا ہے' اس طرح وہ مجھ سے بڑی بڑی رعایتیں
حاصل کرتا رہے گا۔"

ظہیر نے کہا۔ "میں مانتا ہوں۔ کاروبار کبھی میری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میں
پروفیسر ہوں۔ ڈھنگ کی ملازمت کر رہا ہوں۔ ماہانہ اٹھارہ سو مل جاتے ہیں۔ اگر ہزار
روپے تک پارٹ ٹائم نوکری مل جائے تو ہماری پریشانی دور ہو جائے گی۔"

"بھئی' یہ ملازمت والی بات نہ کرو۔ یوں تو میں کسی بھی پرائیویٹ ادارے' یا
فیکٹری میں تمہیں لگا سکتا ہوں۔ ہزار کیا ڈیڑھ ہزار بھی مل سکتے ہیں لیکن میں کسی سے
آنکھ نہیں ملا سکوں گا۔ ایک کمشنر کا بھائی ان کے ہاں نوکری کرے گا جو ہمارے
دروازے پر آکر ہاتھ جوڑتے ہیں۔ اگر اللہ کے بعد کسی کو سجدہ جائز ہوتا تو کتنے ہی غلط
دھندا کرنے والے سرمایہ دار مجھے سجدہ کرتے۔ تم اندازہ کرو' میری کتنی عزت ہے۔
کیا میں تمہاری پارٹ ٹائم ملازمت کے لئے اپنی عزت کو خاک میں ملا دوں۔"

ظہیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہی تھی' بھائی
جان نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے نیند آرہی ہے۔ تم جاؤ' پریشان ہونے کی ضرورت
نہیں ہے۔ جب لڑکیوں کی شادی ہوئی تو میں ہزار دو ہزار سے مدد کروں گا۔"

"کیا ہزار دو ہزار سے شادی ہو جاتی ہے؟"

"زیادہ دھوم دھام کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی حیثیت کے مطابق پاؤں پھیلاؤ۔
ہاتھ پھیلاؤ گے تو ہمیں شرم آئے گی۔ خدا کے لئے کسی کے پاس مدد مانگنے نہ جانا۔ تم

ہمارے لئے کچھ نہیں کر سکتے مگر ہماری عزت تو رکھ سکتے ہو۔"

ظہیر وہاں سے چلا آیا۔ وہ دوسرے دن منجھلے بھائی کے ہاں گیا۔ دونوں بھائیوں کے پاس بے حساب دولت آ رہی تھی۔ دونوں نے کراچی کے ڈیفنس اور لاہور کے گلبرگ میں شاندار کوٹھیاں بنائی تھیں۔ ہر کوٹھی میں چار چار گاڑیاں تھیں۔ ان کے تمام بچے یو کے اور اسٹیٹس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کی پوری فیملی یہاں کی گرمی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ ماہ دو ماہ کے لئے سوئٹزر لینڈ جایا کرتی تھی۔ ہر سال عید کی شاپنگ لندن اور پیرس میں ہوا کرتی تھی۔ ظہیر واقعی کتابوں کی دنیا سے باہر دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کوئی اس سے پوچھتا کہ بھائیوں کے پاس دولت کہاں سے آ رہی ہے تو وہ سادگی سے کہہ دیتا۔ "اللہ دے رہا ہے۔"

اس کے منجھلے بھائی بہت بڑے پولیس افسر تھے۔ جب وہ ان کے گھر پہنچا تو بھید کھلا کہ اللہ نہیں دے رہا ہے۔ یہ تو رشوت خوروں نے تکیہ کلام بنا رکھا ہے۔ نوٹوں کی بڑی بڑی گڈیاں اسمگلروں سے لیتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ "اللہ دے رہا ہے۔"

ایک ایماندار پولیس افسر نے منجھلے بھائی کی وردی اتروادی تھی۔ انہیں رنگے ہاتھوں مکمل ثبوت کے ساتھ رشوت لیتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔ اب ان پر مقدمہ چلنے والا تھا۔ سرکار کی طرف سے بنگلہ خالی کرنے کا نوٹس آیا تھا۔ اس کی منجھلی بھابی کو رہائش کی فکر نہیں تھی۔ ایسے ہی برے وقت کے لئے ڈیفنس میں ایک کوٹھی بنائی گئی تھی۔ جدہ اور لندن میں پاکستانی کھانوں کے ہوٹل خوب منافع دے رہے تھے۔ انہیں صرف اپنے شوہر کی فکر تھی' وہ چاہتی تھیں' انہیں لمبی سزا نہ ہو اس کے لئے وہ نماز پڑھ رہی تھیں' دعائیں مانگ رہی تھیں' یتیم خانے سے بچوں کو بلا کر کہا تھا۔ "یہاں روز ایک وقت کا کھانا ملے گا۔ چالیس دن تک روز قرآن خوانی ہونا چاہئے۔ چالیس بار قرآن ختم ہونے پر ہر بچے کو نئے کپڑے سلوا کر دوں گی۔"

ظہیر شرم سے سوچنے لگا۔ "کیا منجھلے بھائی قانون کے محافظ رہ کر بھی مجرمانہ زندگی گزار رہے ہیں؟"

آمنہ نے کہا۔ "آپ دوسروں کو کتاب کی طرح اوپر سے پڑھتے ہیں۔ انہیں اندر سے کبھی سمجھ نہیں سکیں گے۔ آپ کے بڑے بھائی جان بھی یہی کرتے ہیں۔"

"زبان کو لگام دو۔ اگر ایک بھائی ایسا نکل گیا ہے تو کیا تم مجھے بھی مجرم کہو گی؟"

"آپ کی اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بڑے بھائی جان کی تنخواہ آپ سے ہزار پانچ سو روپے زیادہ ہوگی۔ کیا اتنا سا فرق ہمیں غریب اور انہیں انتہائی دولت مند بنا سکتا ہے؟"

"ہاں' یہ سوچنے کی بات ہے مگر بڑے بھائی جان ایسے نہیں ہو سکتے۔ میری دعا ہے' منجھلے بھائی جان کو سزا نہ ہو۔ وہ باعزت بری کر دیئے جائیں گے۔"

"آپ ایک پروفیسر ہیں۔ قانون کا احترام کرنے والے شہری ہیں۔ آپ کو بھائی بن کر کسی بھی مجرم رشتے دار کے لئے دعا نہیں مانگنا چاہئے۔"

"تم بھائی جان کے لئے ایسے الفاظ استعمال نہ کرو۔ مجھے دکھ پہنچتا ہے۔"

"اگر ہماری بیٹیوں کی شادیاں سر پر ہوں۔ لاکھوں روپے کے جہیز کا مطالبہ کیا جا رہا ہو۔ ایسے میں آپ کو گندی گلی سے دولت مل رہی ہو تو آپ کیا کریں گے؟"

ظہیر سوچتے ہوئے اس کا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا۔ "یہی سوال تم سے کرتا ہوں تم کیا کرو گی؟ دولت قبول کرو گی؟ یا بیٹیوں کو کنواری بٹھا کر بوڑھی کر دو گی؟"

وہ بھی سوچتے ہوئے ظہیر کا منہ تکنے لگی۔ شرافت اور دیانتداری کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب بدترین حالات ٹھوکر مارتے ہیں تو اپنی حد میں رہنے والے حد سے باہر جا گرتے ہیں۔ آمنہ کانپ گئی۔ توبہ کرتے ہوئے بولی۔ "اللہ کرے' ہم پر ایسا وقت آئے۔ میں تو مر جاؤں گی"

"درست کہتی ہو۔ شرافت کو مارنے سے بہتر ہے' ہم خود مر جائیں۔ یا حالات سے لڑتے رہیں اور ثابت کرتے رہیں کہ مجبوریاں ہمیں کو مجرم نہیں بنا سکتیں۔"

اگر دولت کمانے والوں کی نظروں سے دیکھا جائے تو ظہیر جیسے سفید پوش طبقے سے تعلق رکھنے والے بزدل ہوتے ہیں۔ اپنی عزت سے ڈرتے ہیں۔ پولیس والے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر گھر سے لے جائیں گے تو محلے والوں کے سامنے گردن جھک جائے گی۔ اخبار میں تصویر چھپے گی' کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ تھانے میں لات جوتے پڑیں گے۔ جیل میں صبح سے شام تک محنت مزدوری کرنا پڑے گی۔ اسی لئے بزدل لوگ شرافت کا سہارا لیتے ہیں اور صبر کا میٹھا پھل کھانے کا انتظار کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔

کچھ عرصے بعد پولیس والوں نے ظہیر کے پڑوس میں چھاپا مارا۔ چپل کا کارخانہ

چلانے والے پڑوسی نے پرانے مکان کی جگہ کوٹھی بنالی تھی۔ وہ پڑوسی کوٹھی کے ایک حصے میں ایسی چپلیں تیار کرتا تھا جو بیرون ملک بھیجی جاتی تھیں۔ پولیس والوں نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی کوٹھی سے ہیروئن کا اچھا خاصا ذخیرہ برآمد ہوا۔ وہ چپلوں کے اوپر اور تلے کے اندر ہیروئن کی تہہ بچھا کر سلائی کرتا تھا۔ ایسی چپلیں دور کے رشتے کا ایک بھائی ایکسپورٹ کرتا تھا۔ دونوں گرفتار کرلئے گئے تھے۔

آمنہ نے کہا۔ "جرم کرنے والے یہ کیوں نہیں سوچتے کہ قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں۔ وہ ایک دن ضرور پکڑے جائیں گے۔"

"دیکھنا یہ ہے کہ پکڑے جانے کے بعد کیا ہوتا ہے؟"

ظہیر کے منجھلے بھائی جان کو ایک سال کی سزا ہوئی اور پچیس ہزار روپے جرمانہ کیا گیا۔ پچیس اور پچاس لاکھ کمانے والوں کے لئے پچیس ہزار کچھ نہیں ہوتے۔ بھائی جان نے یہ رقم فوراً ادا کردی۔ عید کے پُرمسرت موقع پر حکومت نے قیدیوں کی سزا میں ایک ماہ کی تخفیف کا اعلان کیا اور منجھلے بھائی جان گیارہ ماہ میں چھوٹ کر آگئے۔ دیکھا جائے تو ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ صرف نوکری گئی اور نوکری کی اب ضرورت بھی نہیں تھی۔ کافی کاروبار پھیلا ہوا تھا۔ جیل جانے سے کوئی خاص بے عزتی نہیں ہوئی تھی کیونکہ واپسی پر ڈیفنس میں رہائش اختیار کی تھی اور ڈیفنس میں سبھی عزت دار لوگ رہتے ہیں۔ وہاں کوئی کسی پر انگلی نہیں اٹھاتا۔

ظہیر کے پڑوسی کا معاملہ کچھ مختلف رہا۔ اس کا نہ جرم ثابت ہوا نہ جیل ہوئی۔ گھر سے تھانے تک جاتے جاتے معاملات طے ہوگئے۔ پڑوسی نے کہا۔ "حضور انسپکٹر صاحب! مجھے زیادہ سے زیادہ سال دو سال کی سزا ہوگی۔ بیس پچیس ہزار کا جرمانہ ہوگا۔ آپ خاصے سمجھ دار ہیں' میں ابھی پچیس ہزار دے سکتا ہوں۔ آپ انکار کریں گے تو یہ رقم خواہ مخواہ سرکاری خزانے میں چلی جائے گی۔"

اس نے سوچا۔ اگر ایف آئی آر لکھے گا۔ اسے حوالات یا جیل بھیجے گا تو اس کے سروس ریکارڈ میں عمدہ کارکردگی کا اضافہ ہوگا مگر تنخواہ نہیں بڑھے گی۔ کارکردگی میں اضافہ کرنے اور ترقی پانے کے لئے کسی کنگلے مجرم کو خطرناک مجرم بنا کر پیش کردیا جائے گا' پچیس ہزار کی رقم معمولی نہیں ہے۔

اس نے رپورٹ لکھ دی۔ چپل کے کارخانے پر چھاپا مارا گیا۔ کوئی قابلِ اعتراض

چیز برآمد نہیں ہوئی۔ کارخانے کا مالک معزز شخص ہے۔ نہایت ایمانداری سے چپلیں تیار کرتا ہے۔ ہیروئن سمگل کرنے والے ایکسپورٹر سے اس کے کاروباری تعلقات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ محلے کے مندرجہ ذیل معزز افراد نے کارخانے کے مالک کے حق میں گواہی دی ہے اور اپنے دستخط کئے ہیں۔

محلے کے کئی لوگوں کو پکڑ کر تھانے لایا گیا اور ان سے دستخط کرائے گئے۔ شام تک پڑوسی چھوٹ کر آگیا۔ آمنہ اور ظہیر حیران تھے۔ قانون کے ہاتھ لمبے ضرور ہوتے ہیں۔ مجرم ضرور پکڑے جاتے ہیں۔ مگر پکڑے جانے کے بعد کیا ہوتا ہے؟

کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے شریف گھرانوں کے لوگوں میں بھی چھوٹے بڑے جرم کرنے کا حوصلہ پیدا ہورہا ہے۔ ان کے پڑوسی کا کیا بگڑا؟ صرف اس ایکسپورٹر سے تعلقات ختم ہوگئے۔ اب اسے غلط دھندے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا بیٹی کی شادی کرنا تھی کردی' دو منزلہ کوٹھی بنالی۔ اوپر کا حصہ کرائے پر دے دیا۔ ہزار روپے کی ماہانہ آمدنی ہوگئی' کارخانے سے کچھ رقم آنے لگی۔ میاں بیوی کا گزارا ہونے لگا۔ اب کوئی ضرورت نہیں تھی' کوئی شوق نہیں تھا کوئی اہم مسئلہ نہیں رہا تھا۔ پھر وہ جرم کی طرف کیوں جاتا؟

آمنہ نے کہا۔ "عزت اور شرافت سے زندگی گزارنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔"

ظہیر نے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

"میں بھی کہیں نوکری کروں گی۔ کسی گارمنٹس فیکٹری میں سلائی کروں گی۔"

"میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا۔ تمہاری بینائی اور کمزور ہوجائے گی۔"

"میں کوئی دوسرا کام کروں گی۔ چھوٹی کلاس کے بچوں کو ٹیوشن پڑھاؤں گی۔"

ظہیر نے اعتراض کیا۔ دو چار مہینے کی بھاگ دوڑ کے بعد دو بچے سو سو روپے کے حساب سے پڑھانے کو ملے۔ ماہانہ آمدنی میں صرف دو سو کا اضافہ ہوا۔ دوسری بیٹی دسویں جماعت میں تھی۔ اگلے برس وہ بھی کالج میں پہنچنے والی تھی۔ تعلیم زیادہ اہم تھی' زیادہ محنتی تھی' لڑکیوں کی شادی کے لئے بچت نہیں ہورہی تھی۔ انہوں نے بیس برس میں صرف اٹھارہ ہزار بچائے تھے' اس کے بعد حالات بچت کی اجازت نہیں دے رہے تھے پھر دکھ بیماری تو سبھی کے ساتھ لگی رہتی ہے اور یہ بھی مقدر کی خرابی ہوتی

ہے جو بچت کو کھاجاتی ہے۔

آمنہ نے بچوں کو گھر جاکر پڑھانا چھوڑ دیا۔ ایک ٹیوشن سنٹر میں ماہانہ چھ سو روپے ملنے لگے۔ وہاں ایک ہیڈ مسٹریس صاحبہ تھیں انہوں نے وہ تعلیمی مرکز قائم کیا تھا پتا نہیں خود ان کی تعلیم کتنی تھی۔ ان کے ماتحت رہ کر آمنہ جیسی استانیاں ان کی تعلیمی صلاحیتوں کو چیلنج نہیں کر سکتی تھیں' وہ بچوں کو اردو پڑھاتی تھیں' بچے اپنی کاپیوں میں غلط ہجے لکھتے تھے۔ بولتے وقت تذکیر و تانیث کی غلطیاں کرتے تھے کیونکہ ہیڈ مسٹریس صاحبہ خود غلطیاں کرتی تھیں۔

آمنہ حیران تھی کہ ایسی عورتیں تعلیمی مرکز کیسے قائم کر لیتی ہیں۔ ایسے پرائیویٹ تعلیمی اداروں کا سرکاری طور پر محاسبہ نہیں ہوتا۔ ایک بار ٹیچر ٹریننگ سینٹر سے ایک نئے افسر صاحب آئے تھے' انہوں نے گفتگو کے دوران کہا۔ "محترمہ' آپ کی اردو لینگویج بہت کمزور ہے۔"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "میرا فیملی میں سب انگریزی بولتا ہے۔ اسی لئے میں نے انگلش میڈیم والا اسکول بنایا ہے۔ کم آن لٹ اس اسپیک ان انگلش............"

وہ صاحب انگریزی سن کر سٹپٹائے کیونکہ وہ انگریزی زبان میں کمزور تھے' جلدی سے اٹھ کر بولے۔ "آل رائٹ آل رائیٹ۔ میں آپ کے اسکول کے تعلیمی معیار سے مطمئن ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے۔ میں دوسرے اسکولوں کا معائنہ کرنے جارہا ہوں۔"

وہ افسر صاحب بھاگ گئے۔ آمنہ نے گھر آکر ظہیر سے کہا۔ "بچوں کو الٹی سیدھی تعلیم دی جارہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں؟"

ظہیر نے پوچھا۔ "پرابلم کیا ہے؟"

"ہماری ہیڈ مسٹریس دس برس تک لندن میں رہ کر آئی ہیں' تعلیم نام کو نہیں ہے لیکن انگریزی فرفر بولتی ہیں۔ سنا ہے' وہاں کسی انگریز کے ہاں باورچن تھیں۔ ہمارے لوگ بچوں کو انگلش میڈیم سے پڑھانا چاہتے ہیں لیکن وہ پڑھانے والوں کی تعلیمی صلاحیتوں سے ناواقف ہوتے ہیں۔ یہ تحقیق نہیں کرتے کہ انگلش میڈیم اسکول قائم کرنے والے باقاعدہ کالج یا یونیورسٹی سے آئے ہیں یا یورپ اور امریکا کے باورچی خانوں سے؟"

"اس مسئلے پر ہم دونوں کچھ نہیں کر سکتے۔"

"میں ایسے تعلیمی ادارے کو چھوڑ سکتی ہوں لیکن معصوم بچوں کو اور ان کے والدین کو دھوکا نہیں دے سکتی۔"

"دھوکا تب ہوگا' جب تم بچوں کو غلط تعلیمی ماحول میں چھوڑ کر آؤگی۔ تمہارا فرض ہے کہ وہاں رہ کر غلطیاں درست کرو۔ ہیڈ مسٹریس کو بھی سمجھانے کی کوشش کرو کہ وہ بچوں کو نہ پڑھائے۔ بے شک' وہ ہیڈ مسٹریس کی کرسی پر ساری زندگی بیٹھی رہے لیکن بچوں کی زندگی برباد نہ کرے۔"

آمنہ نے یہی کوشش کی لیکن ہیڈ مسٹریس یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ "یہاں کا بڑا بڑا گریجویٹ اور یونیورسٹی میں ایجوکیشن دینے والا پروفیسر لوگ میرا مافق فرفر انگریزی نہیں بول سکتا۔ جاہل وہ ہے' میں نہیں ہے۔"

ہیڈ مسٹریس سے کوئی بحث نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بحث کرنے والی کسی بھی مس کو برداشت نہیں کرتی تھی............ اسے اپنے اسکول سے نکال دیتی تھی' اس کی جگہ دوسری ہم نوا کو لے آتی تھی۔ چھ ماہ بعد بچوں کے امتحانات ہوئے ہیڈ مسٹریس نے تمام استانیوں کو بلا کر پوچھا۔ "تم لوگ ملک حیات صاحب کو جانتا ہے؟"

ایک مس نے کہا۔ "میں جانتی ہوں۔ ملک صاحب الیکشن میں کامیاب ہوئے ہیں۔"

"ہاں۔ ملک حیات صاحب کا چھوکرا ہمارا اسکول میں پڑھتا ہے۔"

آمنہ نے کہا۔ "جی ہاں' وہ میری کلاس میں ہے۔ بہت ہی کند ذہن ہے۔ اسے کوئی سبق یاد نہیں رہتا۔ ہمیشہ ڈانٹ سنتا رہتا ہے۔"

"اوہ نو' اس کو ڈانٹنے کا ضرورت نہیں ہے۔ اس کا اے ون تعلیمی رپورٹ تیار کرو۔ امتحان میں اس کو فرسٹ پوزیشن دو۔"

آمنہ حیرت سے بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں! وہ تو کسی بھی سبجیکٹ میں پاس نہیں ہو سکے گا۔"

"جب تم پاس کرے گا تو کیوں نہیں ہوگا۔ میں وہ رپورٹ کارڈ لے کر ملک صاحب سے ملاقات کرے گا۔ وہ خوش ہوگا وہ سفارش کرے گا تو ہمارا یہ اسکول میٹرک لیول تک ہو جائے گا۔ ہم لوگ کو گورنمنٹ سے ایڈ ملنے لگے گا۔"

آمنہ نے کہا۔ "حکومت سے رقم کی صورت میں امداد حاصل کرنا اور اسکول کو میٹرک لیول تک لانا ہماری' آپ کی ذمے داری ہے۔ ہم تعلیمی معیار بلند کریں گے۔ بچوں کو ہونہار طالب علم بناتے رہیں گے۔ ان کے تعلیمی نتائج وزارتِ تعلیم کے شعبوں تک پہنچاتے رہیں گے تو.........."

ہیڈ مسٹریس نے بات کاٹ کر سخت لہجے میں کہا۔ "اتنا لمبا بات مت کرو۔ میرے کو اتنا لمبا راستہ مت دکھاؤ۔ یہ کام دو دن میں ہوگا اور یہ میں کرکے دکھائے گی۔"

آمنہ نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میری کلاس میں ایک لڑکا نعیم الدین بہت ذہین ہے۔ ہر سبجکٹ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتا ہے۔ ہر سال اول آتا ہے۔ ایک ہونہار طالب علم کا حق مار کر کسی غبی اور کند ذہن لڑکے کو فرسٹ پوزیشن دینا کھلی ناانصافی ہے۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"مت کرو۔ میرا اسکول سے چھٹی کرو۔"

آمنہ نے ہمیشہ کے لئے چھٹی کرلی۔ ماہانہ چھ سو روپے کی آمدنی ختم ہوگئی۔ ہاتھ آنے والی رقم بھلا کون چھوڑتا ہے؟ مگر ابھی کچھ لوگ ہیں جو بے ایمانی کا ایک پیسہ لیتے وقت کانپ جاتے ہیں۔ ان کے اندر سے آواز آتی ہے۔ "اللہ دیکھ رہا ہے۔"

اس کی بڑی بیٹی بارھویں جماعت میں تھی۔ ایک اچھے خاندان سے رشتہ آگیا۔ لڑکا سعودی عرب میں مکینک تھا۔ طے پایا کہ وہ دو برس بعد چھٹی لے کر آئے گا تو شادی کردی جائے گی۔ آمنہ اور ظہیر اتنا اچھا خاندان اور اچھا کمانے والا داماد پاکر بہت خوش تھے۔ وہ تمام رشتے داروں کے ہاں مٹھائی لے کر گئے اور یہ خوشخبری سنائی۔ ظہیر نے اپنے دونوں بھائیوں سے کہا۔ "دو برس دیکھتے ہی دیکھتے گزر جائیں گے۔ ہمارے پاس کم رقم ہے۔ اگر آپ کچھ مدد کریں گے تو عزت رہ جائے گی۔ خاندانی رکھ رکھاؤ کے ساتھ آپ کی بھتیجی رخصت ہوجائے گی۔"

بڑے بھائی نے کہا۔ "تم نے جہیز دینے کے لئے سامان کی فہرست بنائی ہوگی۔ اس فہرست میں میری طرف سے ایک الماری لکھ لو۔"

"بھائی جان! صرف الماری سے کیا ہوگا؟ نقد رقم کی بھی ضرورت ہوگی۔"

بھائی نے کہا۔ "زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا ہاتھ کھینچ کر خرچ کرو۔ سادگی اور کفایت شعاری سے شادی ہوجائے گی۔"

ظہیران کا منہ تکنے لگا۔ پچھلے برس انہوں نے بڑی بیٹی کی شادی میں پانچ لاکھ کا جہیز دیا تھا۔ کھانے کی دعوت انٹر کان کے مہنگے ڈائننگ ہال میں ہوئی تھی۔ بھائی جان نے ظہیر کی نگاہوں کو پڑھ لیا۔ جلدی سے بولے۔ "میاں! ہمارے ہاں شادی کے لئے ابھی اور دو بیٹیاں بیٹھی ہیں۔ ہمیں اپنے اسٹیٹس کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ دار اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدار ہماری تقریبات میں آتے ہیں۔ اسی حساب سے ہمیں خرچ کرنا پڑتا ہے۔ تم پروفیسر ہو۔ گھر کے سامنے شامیانہ ڈال کر بیٹی کو رخصت کرسکتے ہو۔ تمہارے ہاں دعوت میں آنے والے تمہاری ہی سطح کے لوگ ہوں گے تمہیں فضول خرچی سے بچنا چاہئے۔ یہ ہمارا نیک مشورہ ہے۔"

"بھائی جان! میرے اختیار میں ہو تو میں چائے بسکٹ میں نکاح پڑھا کر بیٹی کو رخصت کردوں۔ مگر آپ لوگوں کی شان و شوکت دیکھ کر ہماری سطح کے لوگ بھی ہاتھ پاؤں پھیلا رہے ہیں۔ آپ باراتیوں کو انٹر کان میں بلاتے ہیں۔ ہماری سطح کے لوگ عام میرج ہال میں بلانے لگے ہیں۔ آپ پانچ دس لاکھ کا جہیز دیتے ہیں۔ ہمیں کم از کم دو لاکھ خرچ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔"

"اگر تمہارے لوگ ہماری نقل کرتے ہیں تو اس میں ہماری غلطی نہیں' ہر آدمی کو اپنی حیثیت سمجھ کر رسم و رواج پر عمل کرنا چاہئے۔ چلو تم اتنے ہی پریشان ہو تو میں ایک الماری کے ساتھ دو ہزار روپے بھی دے دوں گا۔ اس سے زیادہ کی توقع نہ کرو۔"

ایک طرح سے بھائی جان درست کہہ رہے تھے لیکن ظہیران لوگوں کو کیسے سمجھا سکتا تھا جو لاکھوں کا جہیز مانگتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی منگنی توڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اول تو اتنا اچھا لڑکا مشکل سے ملتا ہے۔ دوم منگنی ٹوٹنے کا مطلب ہمیشہ یہی سمجھا جاتا ہے کہ لڑکی میں خرابی ہے۔ بیٹھے بٹھائے بے چاری لڑکی پر عیب لگ جاتا ہے اور ماں باپ اس کی طرف سے سفارش پیش کرنے میں ہمیشہ ناکام رہ جاتے ہیں۔

آمنہ اپنے بھائیوں کے پاس مدد مانگنے گئی تھی۔ اس کے تین بھائی تھے۔ بڑے کا نام اسدیار خان' منجھلے کا نام احمد یار خان اور چھوٹے کا نام خالد یار خان تھا۔ چھوٹا بھائی خالد بے روزگار تھا۔ اس نے کبھی ڈھنگ کا کوئی کام نہیں کیا تھا۔ ثمینہ کے عشق میں خاصا بدنام ہو رہا تھا.......... آمنہ سب سے بڑی تھی۔ سبھی اس کا ادب کرتے تھے۔

احمد یار خان نے ادب سے کہا۔ "آپا! ہمارے ہاں بھی لڑکیاں جوان ہو رہی ہیں۔ آپ سے زیادہ ہم پریشان ہیں۔ یہ تقدیر کی ستم ظریفی ہے۔ ہم سب کے گھر میں صرف ایک ایک بیٹا ہے۔ باقی بیٹیوں کی بھرمار ہے۔ ہم ان کے لئے سوچتے سوچتے وقت سے پہلے بوڑھے ہو رہے ہیں۔ خدانخواستہ وقت سے پہلے مرگئے تو ان لڑکیوں کا کیا بنے گا؟"

یہ تمام والدین سوچتے ہیں اور سوچ سوچ کر سہم جاتے ہیں کہ ان کی زندگی میں لڑکیوں کے ہاتھ پیلے نہ ہوئے تو مرنے کے بعد انہیں کون پوچھے گا؟ احمد یار خان نے کہا۔ "ہم اپنی حیثیت کے مطابق کچھ کرسکتے ہیں۔ آپ نے جہیز کے سامان کی فہرست بنائی ہوگی۔ اگر اس سامان میں ہزار یا پندرہ سو کی کوئی چیز آتی ہو تو وہ ہم خرید کر دے دیں گے۔"

منجھلے بھائی نے بھی ہزار پندرہ سو کا وعدہ کیا۔ وہ مایوس ہر کر اپنے ابا جان صمد یار خان کے پاس آئی۔ وہ صحن میں چارپائی پر بیٹھے کھانس رہے تھے، سامنے ہی گندی گلی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے اُڑتی ہوئی گرد اندر آرہی تھی اور ان کی کھانسی میں اضافہ کررہی تھی۔ آمنہ چارپائی پر بیٹھ کر بولی۔ "ابا جان! میں تھک گئی ہوں۔"

انہوں نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا پھر پوچھا۔ "کیا بہت دور سے آئی ہو؟"

"ہاں، بائیس برس کے لمبے راستے سے آرہی ہوں۔ جب سے شادی ہوئی ہے، سکون کا سانس نہیں لیا ہے۔ کوئی نہ کوئی فکر کھاتی رہتی ہے۔ لڑکیوں کی فکر تو مار ہی ڈالے گی۔ آپ میری شادی نہ کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں بابل کے آنگن میں کھیلتی رہتی اپنی گڑیوں کا بیاہ رچاتی، کوئی جہیز مانگنے آتا تو میں انہیں دھتکار دیتی۔ جاؤ یہاں سے میری تمام گڑیا کنواری رہیں گی۔ ماں کے دل میں اور بابل کے آنگن میں بہت جگہ ہے لیکن حقیقتاً جگہ نہیں ہوتی، میری ماں نے مجھے ظہیر کے گھر بھیج دیا۔ وہاں میں نے بیٹیاں پیدا کیں اور فکر میں گھلنے لگی۔ میں کسی طرح مرکھپ کے بیٹیوں کو سسرال بھیجوں گی۔ وہ وہاں بیٹیاں پیدا کریں گی اور فکر میں گھلنے لگیں گی کیا یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا؟ ہمیں فکر اور پریشانی سے کوئی نجات نہیں دلائے گا؟"

وہ بول رہی تھی، بولتی جارہی تھی۔ پھر احساس ہوا کہ وہ دیوار سے بات کررہی ہے۔ صمد یار خان بیٹھے بیٹھے سو رہے تھے۔ بڑھاپا ایسا ہی ہوتا ہے، بیٹھے ہی بیٹھے مراقبے

میں پہنچادیتا ہے۔ آمنہ نڈھال سی ہو کر گھر پہنچی۔ ظہیر اس سے زیادہ نڈھال ہو کر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ آمنہ نے بڑی بیٹی سے کہا۔ "ذرا پانی پلاؤ۔ یہ گھر دو قدم اور دور ہوتا تو میں گر پڑتی۔ مجھ میں تو اب کھڑے رہنے کی ہمت نہیں ہے۔"

وہ بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ بڑی بیٹی نے پانی لاکر پلایا۔ چھوٹی بیٹی نے آکر پوچھا۔ "امی! اگر آپی کی شادی نہیں ہوگی تو کیا قیامت آجائے گی۔"

ظہیر نے آنکھیں کھول دیں۔ آمنہ نے پانی پینے کے بعد گہری گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ہاں، قیامت آجائے گی۔ شادی کی عمر گزرنے کے بعد لڑکی گھر بیٹھی رہے گی تو ہر طرف سے بدنامی کی آندھیاں چلتی ہیں۔ بیٹی! ہم پہاڑ اٹھا سکتے ہیں، بدنامی نہیں اٹھاسکتے۔"

بڑی بیٹی نے اپنی بہن کے ہاتھ تھام کر کہا۔ "آپ ہم پر بھروسا کریں۔ ہم اپنے دروازے پر بدنامی کو آنے نہیں دیں گے۔"

"تم ابھی بچیاں ہو۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھو۔ بدنامی خود نہیں آتی، لائی جاتی ہے اور لانے والے اپنی ہی آستین میں چھپے ہوتے ہیں۔"

بڑی بیٹی نے کہا۔ "ہمارا زمانہ آپ کے زمانے سے بہت مختلف ہے۔ آپ بی اے کرنے کے باوجود گھر اور کالج کے ماحول تک محدود تھیں۔ کالج بھی گھر کے قریب تھا۔ ہم میلوں دور جاتی ہیں۔ بسوں میں، راستوں میں طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس آفت زدہ شہر میں کسی وقت بھی ہنگامہ شروع ہوجاتا ہے۔ ہمارے سامنے پتھراؤ ہوتا ہے۔ فائرنگ شروع ہوجاتی ہے۔ ٹیئر شیل پھینکے جاتے ہیں۔ ہم ایک راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے پر جاتی ہیں، دوسرے راستے پر بھی ہنگامہ ہو تو بچاؤ کا کوئی اور راستہ اختیار کرتی ہیں۔ ہم ان حالات کی ایسی عادی ہوگئی ہیں کہ ہمارے دلوں سے خوف مٹ گیا ہے، جب جگہ جگہ بارود بچھی ہو اور یہ نہ معلوم ہو کہ کہاں قدم رکھنے سے دھماکے ہوں گے تو پھر قدم اٹھانے سے ڈرنا کیسا؟ آگے تو بڑھنا ہی ہے۔ زندگی تو گزارنا ہی ہے۔"

آمنہ نے پوچھا۔ "تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ آپ کے راستوں میں جہیز کی بارود بچھی ہوئی ہے۔ جب ان رستوں سے گزرنا ہی ہے تو پریشان ہونا یا ہماری عمر کے تقاضوں سے ڈر کیسا؟ ہم آپ کے

زمانے کی حوصلہ ہارنے والی ڈرپوک لڑکیاں نہیں ہیں۔ آج ہزاروں لڑکیاں ملازمت کرتی ہیں' اپنے تعلیمی اخراجات بھی پورے کرتی ہیں اور جہیز کا سامان بھی جمع کرتی رہتی ہیں۔ آپ سے اور ابو سے التجا ہے کہ ہمیں کہیں کام کرنے کی اجازت دیں۔ ہماری آنکھوں میں شرم ہے۔ ہمارے دلوں میں اللہ کا خوف ہے۔ آپ کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچے گی۔"

آمنہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا۔ پھر کہا۔ "مجھے اپنی اولاد پر اتنا بھروسا ہے' جتنا میں اپنی ذات پر کرتی ہوں لیکن بات صرف بھروسے کی نہیں ہے۔ بے شک علم حاصل کرنے والی لڑکیاں محنت مزدوری بھی کرتی ہیں۔ جہیز بھی جوڑتی ہیں مگر ایسی لڑکیاں تعلیم پر مکمل توجہ نہیں دے پاتیں۔ ان کا ذہن مختلف مسائل میں الجھا رہتا ہے۔ وہ کسی طرح امتحانات پاس کر کے سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتی ہیں۔ اس کے برعکس تم دونوں بہنیں ہر سال پوزیشن حاصل کرتی ہو' تعلیم پوری توجہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہئے۔ تمہارے حوصلے سے ہمیں حوصلہ ملتا ہے لیکن ہم تمہیں تعلیم سے ہٹ کر کسی اور مسئلے سے نمٹنے کی اجازت نہیں دیں گے۔"

وسیم دروازے پر کھڑا ہوا باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "ابو! میں تو بیٹا ہوں۔ میں کہیں پارٹ ٹائم جاب کر سکتا ہوں۔"

ظہیر نے کہا۔ "ہم بیٹا اور بیٹی میں فرق نہیں سمجھتے' تم تینوں سے ایک جیسی محبت ہے اور تم تینوں پر ایک جیسا اعتماد ہے۔ اس کے باوجود تمہاری امی نے جو کہہ دیا ہے' اسے پتھر کی لکیر سمجھو۔"

"آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم بے حس ہیں۔ ہمیں اپنے ماں باپ کی پریشانیوں کا احساس نہیں ہے۔ ہم مسکرانے والے بے جان گڈے اور گڑیاں ہیں۔ ماں باپ پر قیامت گزرتی رہتی ہے اور ہم مینٹل پیس پر پڑے مسکراتے رہتے ہیں۔ یا پھر ہم نادان بچے ہیں۔ ابھی آپ کے کام نہیں آ سکتے۔ جب ہم تعلیم مکمل کر لیں گے۔ دو چار سال گزر جائیں گے۔ بہنوں کی شادی ہو جائے گی۔ رفتہ رفتہ مسائل کم ہو جائیں گے تو اس کے بعد میں کس کام آؤں گا؟ کیا آپ کو بڑھاپے میں صرف دو روٹیاں کھلانے کی ذمے داری رہ گئی ہے؟ کیا اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لئے میں آج ہی سے کوئی عملی ثبوت نہیں دے سکتا؟"

"بیٹے! والدین جتنا مانگتے ہیں' اتنا ہی دو۔ تعلیم کے میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کرو اور اس سوسائٹی میں اپنے لئے اونچی جگہ بناؤ۔"

وہ تینوں بہن بھائی خاموشی سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ وہ اپنے والدین کے ضدی اصولوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اس حقیقت سے انکار نہیں تھا کہ ان کے ٹھوس اصول اولاد کی ترقی کے لئے ہیں۔ ظہیر نے بچوں کو محبت سے دیکھا پھر پوچھا۔ "کچھ کہنا چاہتے ہو۔ شاید کہہ نہیں سکتے؟"

وسیم نے کہا۔ "آج ہم نوجوانوں اور آپ بزرگوں کی سب سے بڑی آزمائش یہ ہے کہ ہم دیانت دار رہ کر کس طرح حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ امی آپ نے ماہانہ چھ سو روپے کی آمدنی اس لئے چھوڑ دی کہ ایک ذہین طالب علم سے ناانصافی نہیں کر سکتی تھیں۔ آپ کی اور ابو کی شرافت اور دیانت نے ہمیں راہ راست پر رکھا ہے۔ اگر میں گمراہ ہو جاتا تو ابھی پچیس یا تیس ہزار ہمارے گھر میں ہوتے۔"

والدین نے چونک کر بیٹے کو دیکھا۔ بیٹے نے کہا۔ "ابو! آپ بہت بھولے ہیں جس کالج میں برسوں سے پڑھاتے آ رہے ہیں' وہاں کے اندرونی حالات سے بے خبر رہے ہیں۔ آپ یہ تو جانتے ہیں کہ وہاں طلباء کے دو گروہ بن چکے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ جب ان کے درمیان اچانک تصادم ہوتا ہے تو ہتھیار کہاں سے نکل آتے ہیں۔"

ظہیر نے پوچھا۔ "کہاں سے آتے ہیں؟"

"لیبارٹری کے اسٹور روم سے.........."

"تم کیسے جانتے ہو؟"

"جلال احمد بی اے کا اسٹوڈنٹ ہے۔ میرا بچپن کا ساتھی ہے وہ کالج میں ایک گروہ کا لیڈر ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ اگر میں اس کا ساتھ دوں تو مجھے ماہانہ ہزار دو ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ اس کے عوض مجھے اس گروہ کی حمایت کرنا ہوگی اور وقت آنے پر ہتھیار استعمال کرنا ہوگا۔"

ظہیر اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ بڑبڑانے کے انداز میں کہنے لگا۔ "اوہ خدایا! ہتھیار ہمارے کالج کی لیبارٹری میں چھپائے جاتے ہیں اور تمہیں ایسی خطرناک آفر دی گئی اور تم نے مجھے نہیں بتایا۔"

"آپ کی تعلیم و تربیت نے ہمیں مثبت فیصلہ کرنے کی عقل دی ہے۔ میں نے اس کی آفر ٹھکرا دی۔ جلال احمد نے مجھے وارننگ دی ہے۔ اگر میں یہ باتیں آپ کو بتاؤں گا تو آپ پولیس والوں تک پہنچ جائیں گے' اس سے پہلے ہی مجھے اور آپ کو گولی ماردی جائے گی۔"

آمنہ نے سہم کر کہا۔ "نہیں' نہیں۔ آپ میں سے کوئی زبان نہیں کھولے گا۔ وہ غنڈے بدمعاش جہنم میں جائیں۔ ہمیں کسی سے کیا لینا ہے۔"

ظہیر نے کہا۔ "کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میرا کالج' میرے اسٹوڈنٹس تباہی کی طرف جارہے ہیں اور میں آنکھیں بند کرلوں۔ کیا ایک استاد کا یہی فرض ہے؟"

وسیم نے کہا۔ "جلال احمد سے بچپن کی دوستی ہے' اس نے صرف دوستی کا لحاظ کیا ہے ورنہ میرے انکار کرنے پر اس طرح مجھے قتل کردیتا کہ کوئی اس پر شبہ نہ کرتا۔ ابو! نہ جانے اس کی پہنچ کہاں تک ہے۔ میں نے اسے ایک بہت بڑے پولیس افسر کے ساتھ کئی بار دیکھا ہے۔ امی درست کہتی ہیں۔ یہاں ایک استاد کے فرائض کام نہیں آئیں گے' آپ کو کالج کے اندرونی معاملات سے انجان بن کر رہنا ہوگا۔"

"بیٹے! میرا ضمیر مجھے ملامت کرے گا۔"

"اپنے ضمیر کو سمجھایئے کہ اس گھر میں دو جوان بیٹیاں ہیں۔ اگر آپ تھانے میں رپورٹ دینے جائیں گے تو بیٹیوں کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ جلال احمد کا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے۔ وہ دوست بن کر میری بہنوں کی شادی کے لئے ہزاروں روپے دے سکتا ہے اور دشمن بن کر اس گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں آپ کو اسی لئے بتایا ہے کہ آپ کی شرافت اور دیانت نے مجھے اس کا دوست نہیں بننے دیا۔ لہٰذا آپ بھی اسے دشمن بننے کا موقع نہ دیں۔"

آمنہ نے ظہیر سے کہا۔ "نیک اور سعادت مند اولاد ٹھنڈی چھاؤں کی طرح ہے۔ ہم حالات کی دھوپ میں جل کر آتے ہیں اور انہیں دیکھ کر بہت سی پریشانیاں بھول جاتے ہیں۔ ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے' ہماری اولاد کبھی گمراہ نہیں ہوسکتی۔"

وسیم نے پوچھا۔ "ابو! آپ زبان بند رکھیں گے نا؟"

ظہیر نے پریشان ہو کر بیٹے اور بیٹیوں کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "کوشش کروں گا۔"

"کوشش نہیں' عہد کریں۔ آپ کالج کی نہیں' گھر کی فکر کریں۔ اگر آپ ایک

استاد کا فرض ادا کریں گے تو میں گھر کی سلامتی کے لئے جلال احمد کے راستے پر چل پڑوں گا۔"

باپ نے تشویش بھری نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ پھر سوچا ہماری نیکی کام آرہی ہے۔ بیٹا ابھی تک گمراہی سے بچ رہا ہے۔ اس کی ماں اور بہنوں کی زندگی خطرے میں ڈال کر جوان بیٹے کو مشتعل کروں گا تو یہ تباہی کے راستے پر چل پڑے گا۔

اس نے بے بسی سے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ میں خاموش رہوں گا۔"

بیٹی نے کہا۔ "اور امی' آپ یہ وعدہ کریں کہ کسی رشتے دار سے مدد مانگنے نہیں جائیں گی۔"

چھوٹی بیٹی نے کہا۔ "آپی کی شادی ہماری حیثیت کے مطابق ہوگی۔ ورنہ آپ ہمیں ملازمت کرنے کی اجازت دیں گی۔"

آمنہ نے کہا۔ "ملازمت میں کروں گی تم تینوں صرف تعلیم پر توجہ دو۔"

بچوں نے پھر ضد نہیں کی۔ آمنہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے ان کی طرف آنے والے طوفان نے رخ بدل لیا ہے۔ بچوں پر سے بلا ٹل گئی ہے ورنہ بیٹیاں ملازمت کے لئے نکل پڑتیں۔ بیٹا ہاتھوں میں کلاشنکوف اٹھالیتا اور شوہر ڈرگ مافیا کا نشانہ بن جاتا۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا۔ اب چاہے جیسی بھی ملازمت ملے' وہ گھر کی آمدنی میں اضافہ کرے گی۔ بچوں کو تمام مسائل سے دور رکھے گی۔

اس نے کچھ روز بعد ظہیر سے کہا۔ "میں نے اخبار میں ایک اشتہار پڑھا ہے۔ ڈیفنس کے ایک بنگلے میں گورنس کی ضرورت ہے۔"

ظہیر نے کہا۔ "گورنس یعنی گھر میں کام کرنے والی ملازمہ............"

"آپ ملازمہ کیوں کہتے ہیں۔ گورنس کہئے۔"

"کیا انگریزی میں کہنے سے ملازمہ کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ کیا تعلیم حاصل کرنے کے بعد تم دوسرے گھروں میں جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے کے قابل رہ گئی ہو؟"

"میں یہ کام کسی گھر کی چاردیواری میں کروں گی۔ باہر والے مجھے دیکھنے نہیں آئیں گے۔ آپ یہ سوچیں کہ وہ ڈیفنس کا بنگلا ہے۔ اگر کام مل گیا تو ماہانہ ہزاروں کی آمدنی بڑھ جائے گی۔"

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ "ہاں' تنخواہ اچھی ملے گی مگر یہ ہمارے مزاج کے خلاف

ہے۔"

"ہمارے مزاج میں دیانتداری ہے' بس یہی کافی ہے۔ اس کے بعد صرف اولاد کے لئے سوچنا چاہئے۔ اگر ہر ماہ ہزار ڈیڑھ ہزار کی بچت ہو تو ہم دونوں بیٹیوں کو منہ مانگا جہیز دے کر رخصت کر سکتے ہیں۔"

ملازمت اپنی حیثیت کے مطابق ہو یا نہ ہو' کسی سے مدد مانگنے سے بہتر ہے' آدمی اپنی حیثیت سے نیچے اتر کر کام کرے۔ ہو سکتا ہے' اس میں حیثیت مجروح ہوتی ہو لیکن خودداری قائم و دائم رہتی ہے۔

ظہیر ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

☆------☆------☆

گندی گلی میں خاک اڑ رہی تھی۔ شہر میں کئی دنوں سے ہنگامے ہو رہے تھے' کرفیو کا وقفہ برائے نام ہوتا تھا۔ اس وقفے میں میونسپلٹی کے خاکروب نہیں آتے تھے۔ شہر میں نفرت اور گلیوں میں گندگی بڑھتی جارہی تھی۔

صمد یار خان چارپائی پر بیٹھے بیٹھے' لیٹے لیٹے تھک جاتے تھے۔ کبھی کبھی دروازے کے باہر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ اس گلی کے کچرے اور بدبو سے ان کا گہرا رشتہ ہو گیا تھا۔ ان کی اولاد اور دوسرے رشتے دار بھولے بھٹکے ان کے پاس آتے تھے۔ کچرا لہو کے رشتے کی طرح ہمیشہ آس پاس رہتا تھا اور انسان کو محبت اور لگاؤ اسی سے ہوتا ہے جو ہمیشہ پاس رہتا ہے۔ نظروں کے سامنے رہ کر سانسوں میں بستا ہے اور دل میں اترتا ہے۔ انہوں نے کتنی محبت سے گندی گلی کی بدبو کو سانسوں میں بسایا تھا۔ یہ بات صرف بھنگی ہی سمجھ سکتے ہیں۔

انہیں جوان بیٹے بالکل ہی نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ بہوئیں یا پوتے پوتیاں تین وقت ان کے پاس آتی تھیں اور ان کے آگے چارا ڈال کر چلی جاتی تھیں۔ بڑھاپا بیماریوں کا گھر ہوتا ہے۔ کئی برس پہلے ڈاکٹروں سے علاج کرایا گیا۔ اچھی خاصی دوائیں کھلائی گئیں۔ پھر رفتہ رفتہ سب بیزار ہونے لگے۔ ایک بیمار ہفتوں اپنی تیمارداری کے لئے بلائے تو آنے والے ناغہ کرنے لگتے ہیں۔ آخر ان کی دوسری مصروفیات بھی ہوتی ہیں۔ اگر وہ مہینوں بیمار رہے تو ڈاکٹر اسپتال سے چھٹی دے دیتے ہیں۔ نسخے لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ دوائیں جاری رکھی جائیں۔ اگر وہ بیمار ہفتوں' مہینوں سے گزر کر برسوں

تک بیماریوں کو معمول بنالے تو گھر والے بڑی خاموشی سے اس کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں۔

بیٹوں اور بہوؤں نے صمد یار خان کے سرہانے اسپرین کی ٹکیاں لاکر رکھ دی تھیں تاکہ سردرد' بخار ہو تو ایک دو ٹکیاں نگل کر پانی پی لیا کریں۔ قبض یا گیس کی شکایت ہو تو اس کے لئے چورن کی ایک شیشی تھی۔ کھانسی اور سردی سے نجات پانے کے لئے بام اور ایک سیرپ رکھ دیا گیا تھا۔ ان کے سرہانے ایک ٹوٹی ہوئی میز تھی جس پر ڈھیر ساری دوائیں نظر آتی تھیں۔

تینوں بیٹوں میں صرف ایک خالد بے روزگار تھا۔ اکثر گھر میں رہتا تھا۔ اس لئے باپ کے پاس کبھی روٹیاں لے کر آتا تھا۔ کبھی کوئی دوا کھلانے پہنچ جاتا تھا۔ یوں باپ کے پاس آکر بیٹھنے کا ایک مقصد بھی تھا۔ سامنے ہی باورچی خانہ تھا۔ ثمینہ وہاں نظر آتی تھی۔ اُدھر بھابی جان قیامت کی نظر رکھتی تھیں۔ فوراً ہی سر پر پہنچ جاتی تھیں............ "خالد! تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے' جب یہ روٹیاں پکانے اِدھر آئے تو تم اُدھر کمرے میں رہا کرو۔"

"بھابی جان! ایک ہی گھر میں پردہ نہیں ہوتا۔"

"پردہ نہیں ہوتا' پابندیاں تو ہو سکتی ہیں۔"

"یہ میرا گھر ہے' میں پابند نہیں رہ سکتا۔"

"اچھی بات ہے۔ میں آج ہی ثمینہ کو اپنے میکے بھیج دوں گی۔ تم لوگوں کو مجھ سے دشمنی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے' میرا دل کمزور ہے۔ مجھے چولہے کے پاس نہیں جانا چاہئے۔ تمہارے بھائی کی آمدنی اتنی نہیں ہے کہ ایک ملازمہ رکھ لی جائے۔ میری بہن مجھے آرام پہنچانے کے لئے یہاں رہتی ہے تو تم اس کے پیچھے پڑ جاتے ہو۔ کیا گھر سے باہر جاکر بدمعاشی نہیں کر سکتے؟"

"جب مجھے نوکری مل جائے گی۔ میں ہزار دو ہزار کمانے لگوں گا تب آپ مجھے بدمعاش کہنا چھوڑ دیں گی۔ کیونکہ ایک بدمعاش کے سامنے کوئی اسے بدمعاش کہنے کی جرأت نہیں کرتا۔"

بھابی جان کی ایک مجبوری تھی۔ اس کے میکے میں اب کوئی ایسا بزرگ نہیں تھا جس کے سائے میں ثمینہ کو چھوڑا جاتا۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک چچا تھے جو نشہ

کرتے تھے۔ اس لئے بھابی جان نے اسے اپنے ہاں رکھا تھا۔ وہ بے چاری صبح سے شام تک گھر کا کام کرتی رہتی تھی۔ یوں بھابی جان آرام طلب ہوگئی تھیں۔ اب تو اٹھ کر پانی نہیں پیتی تھیں۔ آدھی رات کو بھی آواز دیتی تھیں۔ "ثمینہ' ایک گلاس پانی لادو۔"

وہ طلسمی چراغ کے خدمت گار کی طرح پانی لے کر حاضر ہو جاتی تھی۔ حکم کی تعمیل کرتی تھی۔ پھر چلی جاتی تھی۔ رات کو پھر کسی وقت پکارا جاتا تھا۔ "ثمینہ! بچہ رو رہا ہے' تمہیں سنائی نہیں دیتا۔ شیشی میں دودھ لے آؤ۔"

ایک رات خالد نے ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بولی۔ "کیا کرتے ہو؟ جانے دو۔"

وہ بولا۔ "تم انسان ہو۔ ہل چلانے والے اور بوجھ اٹھانے والے جانور بھی رات کو آرام سے سوتے ہیں۔ کیا یہ تمہاری سگی بہن ہے؟"

"اگر وہ یہاں آگئیں تو قیامت آجائے گی۔"

وہ ہاتھ چھڑا کر چلی گئی۔ خالد کا دل یہ سوچ کر کڑھتا تھا کہ وہ ثمینہ کا ہاتھ نہیں مانگ سکتا۔ ماہانہ مستقل آمدنی کا ذریعہ نہ ہو تو کوئی لڑکی نہیں دیتا۔ وہ ثمینہ کی محبت میں دس جماعتوں سے آگے نہیں پڑھ سکا۔ جلد سے جلد ملازمت حاصل کرنے کی کوشش میں بھٹکنے لگا۔ اسے کئی بار نوکریاں ملیں لیکن وہ عارضی تھیں۔ کبھی مالکوں نے جواب دے دیا۔ کبھی اس نے خود ہی کام چھوڑ دیا۔ کیونکہ جو تھوڑی بہت تنخواہ ملتی تھی' اس کا آدھا حصہ آنے جانے کے کرائے' دوپہر کے کھانے اور سگریٹ پینے میں خرچ ہو جاتا تھا۔ آدھا حصہ بھابی جان لے لیتی تھیں۔ ثمینہ کے لئے کچھ بچانے کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ایسی ملازمت چاہتا تھا جہاں ترقی کے مواقع ملتے رہیں اور اس کی آمدنی دیکھ کر بھابی جان خود ہی ثمینہ کا رشتہ دینے کو تیار ہو جائیں۔

منجھلے بھائی جان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اوپری منزل میں رہتے تھے بھائیوں کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ ابا جان کے اس مکان میں تینوں بھائیوں کا برابر حصہ ہوگا۔ گراؤنڈ فلور بڑے بھائی کے لئے اور پہلی منزل دوسرے بھائی کے لئے مخصوص رہے گی۔ خالد پہلی منزل کے اوپر اپنے حصے کا مکان اسی وقت تعمیر کرا سکتا تھا' جب وہ اچھا کمانے کے قابل ہوتا لیکن ایسے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ جب بھی نوکری چھوڑ کر آتا' بھائی اور بھابیوں سے طعنے ملتے تھے۔ "تم کبھی ڈھنگ کا کام نہیں کرو گے۔ تمہیں

مفت کی روٹیاں توڑنے کی عادت ہوگئی ہے۔"

جوانی اور ناکامی کے اس سنگم پر ہر نوجوان سوچتا ہے' اسے راستہ چلتے ہوئے کسی کا نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس مل جائے کسی طرح سٹے کا نمبر معلوم ہو جائے کسی ویران راستے پر کار کا حادثہ ہو اور حادثے میں مرنے والا سرمایہ دار اس کے لئے لاکھوں روپے چھوڑ جائے۔ کسی ٹرین کا حادثہ ہو اور زخمی مسافروں کو کمپارٹمنٹ سے نکال لانے کے دوران مالِ غنیمت ہاتھ آجائے نیکی کی نیکی ہو اور کمائی کی کمائی۔

لوگ مایوس ہیں۔ حالات سے دل برداشتہ ہیں۔ بے روزگاری' ناکامی اور احساسِ کمتری ان کے اندر بارود کی طرح بھری ہوئی ہے۔ اس بارود کو صرف ایک سلگتی ہوئی تیلی دکھانے کی دیر ہوتی ہے۔ پھر یہ پھٹ پڑتے ہیں۔ اندھی کمائی کے اندھے راستے پر چلے آتے ہیں۔ جس راستے سے دولت آتی ہے' اس راستے سے ایمان رخصت ہو جاتا ہے۔ صرف یہی ایک نقصان ہوتا ہے۔ یہ نقصان برداشت کرکے زندگی کی ہر ناکامی کا منہ توڑ جواب دیا جاتا ہے۔

خالد بھی دلبرداشتہ ہو کر تصور میں نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس دیکھنے لگا تھا۔ ثمینہ اپنے ساتھ ایک شاندار کوٹھی میں نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھ پانچ لاکھ کی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ کر شاپنگ کے لئے جاتی تھی۔ دونوں بھابیاں اس کے دونوں بھائیوں کو شرم دلاتی تھیں' کہتی تھیں۔ "خالد کو دیکھو ثمینہ کو ملکۂ عالم بنا چکا ہے۔ ایک تم لوگ ہو نہ خوب کما سکتے ہو' نہ خوب پہنا سکتے ہو۔ ثمینہ پانچ لاکھ کی گاڑی میں بیٹھتی ہے اور ہم بس میں دھکے کھاتی رہتی ہیں۔"

خالد سوچتا اور خوش ہوتا تھا۔ آدمی کے پاس خوش خیالی اور خوش فہمی نہ ہو تو شاید مایوسیاں اور ناکامیاں اسے ایک دن بھی زندہ نہ رہنے دیں۔ وہ گرمی کے موسم میں چھت پر سوتا تھا۔ سردیوں میں ایک اسٹور روم خالی کر دیا جاتا تھا۔ جہاں وہ بوڑھے باپ کے ساتھ راتیں گزارتا تھا۔ اس کے ابا جان کھانستے ہوئے کہتے تھے۔ "بیٹے! تمہاری بے روزگاری نے تمہیں کسی کام کا نہیں رکھا لیکن میرے کام آرہے ہو۔ میری تنہائی دور کر رہے ہو۔ پہلے میں بڑبڑاتا تھا کوئی نہیں سنتا تھا' اب تم سنتے ہو۔"

"ابا جان! ہماری دنیا میں اسی کی سنی جاتی ہے' جو خود کو منوانا جانتا ہو۔ آپ ایک

گھسے ہوئے پرزے کی طرح ہیں۔ آپ کا بڑھاپا کسی کے کام نہیں آسکتا۔ میں جوان ہوں مگر کھوٹا سکہ ہوں۔ اس دنیا کے کسی بازار میں چل نہیں سکتا۔ ہم دونوں خود کو منوا نہیں سکتے۔ اسی لئے فضول سے سامان کی طرح اس اسٹور روم میں پھینک دیئے گئے ہیں۔"

رات کا ایک بجا تھا۔ بھابی جان کے بیڈ روم میں بچہ رو رہا تھا۔ خالد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے معلوم تھا۔ ثمینہ دستور کے مطابق اٹھے گی۔ کچن میں بچے کے لئے دودھ گرم کرنے آئے گی۔ دودھ گرم رکھنے کے لئے ایک تھرماس رکھا جاسکتا تھا لیکن محدود آمدنی میں تھرماس خریدنا سراسر فضول خرچی ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ کڑکڑاتی ہوئی سردیوں میں آدھی رات کو اٹھ کر دودھ گرم کرنے والی ثمینہ موجود تھی۔ وہاں تین وقت کی روٹیاں کھاتی تھی۔ بھابی جان کی اترن پہنتی تھی۔ نہانے دھونے کے لئے اس گھر کا پانی اور صابن استعمال کرتی تھی۔ اسی لئے گھر کا سارا کام اس سے لیا جاتا تھا۔

وہ اٹھ کر جانے لگا۔ باپ نے کھانستے ہوئے پوچھا۔ "بیٹے' کہاں جا رہے ہو؟"

وہ ناگواری سے بولا۔ "ابا جان! رات کو تو سو جایا کریں۔ دن کو بیٹھے بیٹھے اونگھتے رہتے ہیں۔ مگر سونے کے وقت جاگتے رہتے ہیں۔"

"ناراض کیوں ہوتے ہو۔ میں تمہارے ہی لئے جاگتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا تم اس سے ملنے جاؤ۔ کسی نے دیکھ لیا تو وہ لڑکی بدنام ہو جائے گی۔"

وہ ذرا ہچکچایا۔ بات درست تھی۔ وہ خود ثمینہ کی بدنامی نہیں چاہتا تھا۔ مگر ملاقات کا وہی وقت ملتا تھا۔ دن کو بھابی جان کی نگاہیں پہرا دیتی رہتی تھیں۔ اس نے کہا۔ "ابا جان! بڑی مشکل ہے۔ آپ کی کمر جھک گئی ہے۔ آنکھوں سے اچھی طرح نظر نہیں آتا۔ کانوں سے اچھی طرح سن نہیں پاتے۔ بولتے وقت تھرتھراتے ہیں لیکن ایسی حالت میں بھی اولاد کو نصیحت کرنے سے باز نہیں آتے۔ خدا کے لئے یہ تسلیم کر لیجئے کہ آپ کے نصیحتیں کرنے' ڈانٹنے اور باپ بن کر رہنے کا وقت گزر چکا ہے۔"

وہ اسٹور روم سے باہر آگیا۔ کچن میں روشنی تھی۔ بیڈ روم میں بچہ رو رہا تھا۔ بھابی جان کی آواز آرہی تھی۔ "ثمینہ! کیا افیون کھا کر سوتی ہو؟ بچہ اتنی دیر سے رو رہا ہے' جلدی دودھ لاؤ۔"

"ابھی لا رہی ہوں۔" ثمینہ کچن سے بول رہی تھی۔ خالد' بھابی جان کی آواز سن

کر رک گیا تھا۔ ثمینہ کی آواز سن کر اس کے قدم بڑھ گئے۔ دل بے اختیار تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کچن کے دروازے پر آکر دیکھا۔ وہ فیڈر میں دودھ ڈال رہی تھی۔ آہٹ سن کر چونک گئی۔ سر گھما خالد کو دیکھا۔ جلدی سے سر پر آنچل رکھتے ہوئے کہا۔ "اللہ! آپ ہیں؟' پلیز' چلے جائیں' مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"میں کسی قابل ہو جاؤں گا تو تمہیں ڈر نہیں لگے گا۔"

"سنا ہے' عورت کی تقدیر سے مرد کو روزگار ملتا ہے۔ میری تقدیر کھوٹی ہے' آپ مجھ سے اتنی محبت نہ کریں۔"

"میں کئی بار یہ شہر چھوڑ کر گیا کہ میرے دور ہو جانے سے تمہارا رشتہ کہیں سے آئے گا۔ تمہاری کہیں شادی ہو جائے گی۔ پھر میں تمہیں بھول جاؤں گا لیکن نہیں' دور ہونے کے بعد تم بہت یاد آتی ہو۔ میرا ضمیر کہتا ہے' میں پست ہمت ہوں۔ میں تمہیں اس گھر میں ایک کنیز کی طرح دن رات کام کرنے کے لئے چھوڑ آیا ہوں۔ میں تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا لیکن پیار کے دو بول بولتا ہوں تو تمہاری تھکن دور ہو جاتی ہے۔ ایک نئی امید حوصلہ دیتی ہے کہ ہمارے تمہارے دن پھریں گے۔ یہی سوچ کر میں واپس آجاتا ہوں' تم محبت نہ کرنے کے لئے کہتی ہو۔ جبکہ بدترین حالات میں محبت ہی سہارا دیتی ہے۔"

وہ فیڈر اٹھا کر جانے لگی۔ خالد نے ہاتھ بڑھا کر راستہ روک لیا۔ پھر پوچھا۔ "واپس آؤ گی؟"

"مجھے جانے دو' بچہ رو رہا ہے۔"

"میں یہاں انتظار کروں گا۔ وعدہ کرو' ضرور آؤ گی۔"

"موقع ملا تو آؤں گی۔ مجبوری بھی سمجھا کرو۔"

وہ کچن سے باہر گئی۔ وہ اسے پیار سے دیکھتا ہوا دروازے پر آیا پھر ایک دم سے چونک گیا۔ بڑے بھائی جان صحن میں کھڑے ہوئے تھے۔ ثمینہ سر جھکائے وہاں سے بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس نے کوئی قصور نہیں کیا تھا لیکن چوری چوری کی محبت میں دو چور ہوتے ہیں۔ اگر ایک پیش قدمی کرے' دوسری کتراتی رہے' تب بھی چور ہی سمجھی جاتی ہے۔

بیڈ روم میں بھابی جان کہہ رہی تھیں۔ "میرا بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے۔ کیا تم

دیدے لڑا رہی تھیں یا بھینس والے سے دودھ مانگنے چلی گئی تھیں؟"

ثمینہ کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پتا نہیں' وہ اپنی صفائی میں کیا کہہ رہی تھی۔ بڑے بھائی جان نے آہستگی سے مگر غصے سے کہا۔ "جاؤ سو جاؤ صبح تمہارا فیصلہ ہو گا۔"

خالد ثمینہ کے لئے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر چوری پکڑی گئی تھی۔ ایسے میں چور کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہوتا بلکہ کچھ کہنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ وہ اسٹور روم میں آکر بستر پر گر پڑا' اس کے اندر بے چینی بھر گئی تھی۔ یہ سوچ سوچ کر دماغ گرم ہو رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا' ساری دنیا اس کی دشمن ہے۔ کوئی اسے نہ تو مستقل ملازمت دیتا ہے۔ نہ ہی محبت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ آخر کوئی اجازت کیوں دے گا؟ اس نے سوچا' ہاں مجھ میں آخر خوبیاں کیا ہیں؟ کچھ نہیں ہے۔ میں صرف دو ہی کام کر سکتا ہوں۔ زندہ رہنے کے لئے سانس لے سکتا ہوں اور پیٹ بھرنے کے لئے بھائیوں کا محتاج رہ سکتا ہوں۔ کیا میں اس سے زیادہ کبھی کچھ نہیں کر سکوں گا؟

اس نے کروٹیں بدلتے بدلتے صبح کر دی۔ دماغ میں ابھی تک گرمی بھری ہوئی تھی' یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی چیخنے چلانے لگے گا اور پاگلوں جیسی حرکتیں شروع کر دے گا۔ وہ بستر سے اٹھ کر باہر گندی گلی میں آگیا۔ وہاں گرد اڑ رہی تھی۔ کتنے ہی خاکروب گلی میں پھیلے ہوئے کچرے کو جھاڑو سے سمیٹ رہے تھے۔ دروازے کے پاس ہی ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا' اسے گندگی کا ذرا احساس نہیں تھا۔ بدبو پھیل رہی تھی۔ گرد سانسوں کے ذریعے پھیپھڑوں میں پہنچ رہی تھی اور اس کے حواسِ خمسہ ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس کے اندر برسوں سے ناکامیوں کا کچرا اتنا بھر چکا تھا کہ باہر کا کچرا بے معنی ہو گیا تھا۔

ایک نوجوان اس کے قریب ہی جھاڑو سے کچرا سمیٹ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر خالد نے سوچا "یہ وہی جوان ہے۔ اسے میں دوبار دیکھ چکا ہوں۔ یہ ایک بار بس میں میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری بار ہوٹل میں چائے پی رہا تھا تب یہ سامنے والی میز پر چکن تکہ کھا رہا تھا۔ اس کے جسم پر بہترین لباس تھا اور کلائی میں گھڑی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جھاڑو دینے والے اور غلاظت اٹھانے والے بھنگی چمار ڈیوٹی سے فارغ ہو کر نہاتے دھوتے اور صاف ستھرے کپڑے پہنتے ہیں۔ بسوں میں

ہمارے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہیں' ہوٹلوں میں جا کر ہماری پلیٹوں میں کھاتے ہیں اور ہم ان کی پلیٹوں میں کھا لیتے ہیں۔ ہمیں اونچ نیچ یا طہارت و غلاظت کا پتا ہی نہیں چلتا۔"

پتا کیسے چلے گا؟ چھوٹی ذات والوں کے لئے نہ الگ بستی ہے' نہ الگ بسیں اور تفریح گاہیں ہیں اور نہ ہی ان کے لئے لباس مخصوص ہے' ان کی علیحدہ شناخت صرف اسی وقت ہوتی ہے جب وہ ہاتھ میں جھاڑو پکڑ کر ڈیوٹی پر ہوتے ہیں۔ خالد نے اسے مخاطب کیا۔ "سنو' اِدھر آؤ۔"

وہ قریب آکر بولا۔ "جی صاحب!"

"میں نے تمہیں ایک بار ایک بس میں اور دوسری بار ایک ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"دیکھا ہو گا صاحب! کبھی کبھی آپ جیسے مہربان ہمارے کام سے خوش ہو کر پانچ دس روپے دیتے ہیں۔ جیب میں رقم ہوتی ہے تو کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چکن تکہ اور بوٹی کباب کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

"تم کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"پنجاب سے آیا ہوں۔ بارہ جماعتیں پڑھ چکا ہوں۔"

اس نے شدید حیرانی سے پوچھا۔ "کیا! تم تعلیم حاصل کر کے یہ کام کر رہے ہو؟"

"اپنے خاندان اور باپ دادا کی عزت کے مطابق بہت کام تلاش کیا۔ پانچ برس تک کوئی چھوٹا کام کرنے سے شرماتا رہا۔ پھر میری شادو نے کہا۔ ملازمت نہیں کرو گے تو منگنی ٹوٹ جائے گی۔ چاچا مجھے دوسرے کے پلے باندھ دے گا' میں نے چاچا سے وعدہ کیا کراچی جا رہا ہوں۔ دو مہینے میں ملازمت مل جائے گی۔ پھر دو چار مہینے میں پیسے جوڑ کر آؤں گا اور شادو کو دلہن بنا کر لے جاؤں گا۔"

وہ مختصر سی داستان سنا رہا تھا۔ اسے کراچی میں بھی روزگار کے نام پر ٹھوکریں مل رہی تھیں۔ وعدے کے مطابق ایک مہینہ گزر چکا تھا۔ دوسرا گزر رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ ہمارے ملک سے انگلینڈ اور امریکا جانے والے کتنے ہی لوگ ہوٹلوں میں برتن مانجھتے ہیں اور گٹر صاف کرتے ہیں۔ پھر اپنے ملک میں اپنے لوگوں میں واپس آکر دولت کمانے والے معزز اور قابلِ تعریف شخص کہلاتے ہیں۔

اس نے ایک ہوٹل میں کام کیا۔ وہاں صبح سے رات تک کام کرنا پڑتا تھا۔ اس

کے ایک شناسا نے کہا۔ "میونسپلٹی میں خاکروب کی ملازمت مل سکتی ہے۔"

پہلے تو وہ ایسی نوکری کے متعلق سن کر چکرایا۔ پھر شادو کی خاطر خاکروب بن ہی گیا۔ چاچا کو خط لکھ دیا کہ میونسپلٹی میں کلرک ہوگیا ہے۔ تنخواہ چھ سو روپے ہے۔ الاؤنس اور اوور ٹائم ملا کر ہزار بارہ سو تک کمالیتا ہوں۔ آئندہ ترقی کے مواقع ہیں۔ چاچا اس سے ملنے آیا اس نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تھا۔ بھنگیوں کے سپروائزر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس بات پر اسے آمادہ کرلیا تھا کہ وہ چاچا کے سامنے اسے 'بڑا بابو' کہہ کر مخاطب کرے۔ پھر یہی کیا گیا۔ چاچا خوش ہو کر چلا گیا۔ چار ماہ بعد وہ شادو کو دلہن بنا کر کراچی لے آیا۔ یہی اس کی مختصر سی داستان تھی۔

خالد نے پوچھا۔ "تم کب تک اپنی اصلیت چھپاؤ گے؟"

"میں کچھ نہیں چھپاتا۔ شادو سب جانتی ہے اور شادو کو ہی جاننا چاہئے۔ مجھے دنیا والوں سے کیا لینا ہے۔"

"جو لوگ تمہیں خاکروب کی حیثیت سے جانتے ہیں' وہ تمہیں حقارت سے دیکھتے ہوں گے۔ ایسے وقت تمہیں شرم نہیں آتی۔"

"شرم انہیں آنا چاہئے جو روزگار نہ ملنے کا بہانہ کرکے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔"

خالد کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ یوں محسوس ہوا وہ جوان اسے جان بوجھ کر طعنے دے رہا ہے۔ اس نے ناگواری سے پوچھا۔ "کیا تم چاہتے ہو کہ نوکری نہ ملے تو شریف خاندان کے لڑکے تمہاری طرح بھنگی بن جائیں۔"

"ہاں' یہ چرس اور ہیروئن بیچ کر دولت کمانے سے بہتر ہے۔"

اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر خالد کی طرف بڑھایا۔ پھر اسے سلگا کر ایک کش لینے کے بعد کہا۔ "منشیات ' جوا' سٹہ بازی' کھانوں اور دواؤں میں ملاوٹ اور دوسرے تمام غلط دھندے کرنے والے لوگ شریف ہوتے ہیں' اونچی سوسائٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذرا غور کرو تو ان تمام دھندوں کے ذریعے بیماری اور غلاظت پورے شہر میں پھیلتی ہے اور ہم یہ غلاظت سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ اعلیٰ ہیں' ہم ادنیٰ ہیں۔ میں کتنی ہی لمبی تقریر کروں مگر بھنگی آخر بھنگی ہی رہے گا؟"

اس نے سگریٹ کا کش لیا۔ پھر جھاڑو سے گرد اڑاتا ہوا جانے لگا۔ اس کی باتیں

قابلِ غور تھیں۔ اس سے ہمدردی' دوستی اور محبت ہونا چاہئے مگر کوئی شریف اور عزت دار شخص اسے گلے نہیں لگا سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ گلیوں سے گندگی صاف کرنے کے بعد خود صاف ستھرا ہو کر اُجلے سماج کے اجلے لوگوں کے ساتھ بسوں اور ٹرینوں میں سفر کرتا ہے اور ان کے ساتھ ہوٹلوں میں بیٹھ کر کھاتا ہے۔ ایسے ہی موقع پر کہتے ہیں۔ آنکھوں دیکھی مکھی نگلی نہیں جاتی' یعنی نہ دیکھ کر مکھیاں نگلی جاتی ہیں۔

اب خالد کے دماغ میں یہ خیال گردش کررہا تھا کہ ایک جوان شادو کے لئے اپنی سطح سے نیچے آسکتا ہے۔ وہ اپنی ثمینہ کے لئے ہوٹلوں میں کام نہیں کرسکتا؟ صدر میں پھیری لگا کر مال نہیں بیچ سکتا؟ لوگ کہتے ہیں کہ صدر میں پھیری لگانے والے روزانہ سو دو سو اور کبھی پانچ سو کماتے ہیں۔ صمد یار خان کے خاندان میں کبھی کسی نے کاروبار نہیں کیا تھا۔ کوئی بڑی سی دکان لگانے کے لئے بڑی رقم نہیں تھی۔ ریڑھے پر سامان رکھ کر بیچنے والے لوگ بہت چھوٹے اور ادنیٰ گھرانے کے معلوم ہوتے تھے۔ خود کو اعلیٰ خاندان سے منسوب کرنے والے ہمیشہ احساسِ برتری کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔

دن کے دس بجے اس کے بھائیوں نے اسے کمرے میں بلایا۔ وہاں دونوں بھابیاں اور خاندان کے دو بزرگ موجود تھے۔ انہوں نے اپنے ابا جان صمد یار خان کو اس لئے نہیں بلایا کہ وہ سنتے اور سمجھتے کم تھے۔ ایک بات کو بار بار سمجھانا پڑتا تھا۔ پھر یہ کہ کھانستے کھانستے بلغم تھوکنے لگتے تھے۔ اگرچہ اگالدان میں تھوکتے تھے۔ باپ ہوئے تو کیا ہوا دیکھ کر گھن تو آتی تھی۔

بڑی بھابی نے اسے دیکھتے ہی کھڑکی کی جالی سے منہ لگا کر تھوک دیا۔ پھر غصے سے کہا۔ "میں کچھ نہیں بولوں گی آپ لوگوں کو انصاف کرنا ہوگا۔ اگر میرے ساتھ انصاف نہ ہوا تو میں اپنی بہن کو لے کر ہمیشہ کے لئے چلی جاؤں گی۔"

منجھلی بھابی نے کہا۔ "یہ مجھے شریف اور اعلیٰ خاندان سے بیاہ کر لائے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا ہو تو لڑکے کو گولی مار دیتے ہیں اور لڑکی کو زہر کھلا دیتے ہیں۔"

بڑی بھابی جان نے بھڑک کر کہا۔ "باتوں کی مار مارنا کوئی تم سے سیکھے۔ کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنی بہن کو زہر دے دوں؟"

"اے میں کہنے والی کون ہوتی ہوں؟ میں تو اپنے خاندان کی بات کر رہی ہوں' ہمارے ہاں غیرت مند لوگ یہی کرتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے' ہم بے غیرت ہیں؟"

ایک بزرگ نے ڈانٹ کر کہا۔ "تم آپس میں کیوں لڑ رہی ہو؟"

ایک بولی۔ "کیا میں لڑ رہی ہوں؟ یہ مجھ پر کیچڑ اچھال رہی ہے۔"

دوسری بولی۔ "مجھے کیا ضرورت پڑی کیچڑ اچھالنے کی......... دیور کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں' مجھ پر غصہ اتار رہی ہیں۔"

دوسرے بزرگ نے کہا۔ "میں تم دونوں کو سمجھاتا ہوں' جہاں چار مرد بول رہے ہوں' وہاں عورتوں کو صرف ضرورت کے وقت بولنا چاہئے۔ ہاں تو میاں خالد! یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟"

وہ سر جھکائے مجرم کی طرح خاموش کھڑا رہا۔ بڑے بھائی جان نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں ثمینہ کا کوئی سرپرست نہیں ہے۔ میں اسے اپنے ہاں لے آیا۔ خیال تھا' یہ میرے سائے میں عزت آبرو سے رہ سکے گی لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میرا اپنا بھائی اس بے چاری کو بدنام کرنے پر تل گیا ہے۔ کل اس کا رشتہ کہیں سے آئے گا تو یہ بدنامی رشتہ مانگنے والوں تک پہنچے گی۔"

خالد نے ڈھٹائی سے پوچھا۔ "ثمینہ کا رشتہ کہیں سے کیوں آئے گا؟ آپ لوگوں کو مجھ میں کیا خرابی نظر آتی ہے؟"

بڑی بھابی جان نے کہا۔ "خبردار' ثمینہ کا نام اپنی گندی زبان پر نہ لانا۔ میں تمہارے ساتھ اس کی زندگی برباد نہیں ہونے دوں گی۔ اس سے پہلے ہی اسے زہر دے کر مار ڈالوں گی۔"

منجھلی بھابی نے مسکرا کر کہا۔ "آخر میرے خاندان کی غیرت مندی کو مان لیا' خود ہی زہر دینے کو راضی ہوگئیں۔"

منجھلے بھائی نے ڈانٹ کر کہا۔ "بیگم' خاموش رہو یا کمرے سے چلی جاؤ۔"

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ "کیا یہی میری اوقات ہے؟ مجھے کمرے سے بھگایا جا رہا ہے۔ میں جا رہی ہوں۔"

پھر دماغ میں بات آئی۔ میں چلی جاؤں گی تو بھابی جان کی غیرت کا جنازہ اٹھتے ہوئے آنکھوں سے نہیں دیکھ سکوں گی۔ آج کا تماشا قابلِ دید ہے۔ وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ کر بولیں۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ یہاں جو کانٹا ہے اسے نکالو۔"

چند لمحوں تک خاموشی رہی پھر بڑے بھائی جان نے کہا۔ "تم میرے بھائی ہو۔ اگر تم کسی قابل ہوتے تو میں خوشی سے یہ رشتہ کر دیتا لیکن تم نکمے ہو تم سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ اگر کہیں نوکری کرتے ہو تو ماہ دو ماہ بعد وہاں سے نکال دیئے جاتے ہو۔ تم سے گھر کا بھی کوئی کام نہیں ہوتا۔ بازار سے سودا لانے کو کہا جاتا ہے تو ہر چیز کے دام بڑھا کر بتاتے ہو۔ اس طرح اپنی سگریٹ اور چائے کا خرچ نکال لیتے ہو۔ ثمینہ میری بیٹیوں جیسی ہے۔ میں کسی بھی بیٹی کا رشتہ ایسے کام چور سے نہیں کر سکتا جو چار برس سے اپنے بھائیوں کی کمائی کھا رہا ہو۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "خالد میاں! تمہارے بارے میں جو کچھ کہا جا رہا ہے' وہ حرف بہ حرف درست ہے۔ تمہیں کوئی اپنی لڑکی نہیں دے گا۔"

خالد نے کہا۔ "اگر میں مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ پیدا کر لوں تو؟"

بھابی جان نے کہا۔ "میں پھر بھی ثمینہ کی شادی تم سے نہیں ہونے دوں گی۔"

خالد نے کہا۔ "یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ ثمینہ کی شادی نہیں ہونے دیں گی۔ کیونکہ وہ پرائی ہوگئی تو آپ کو تین وقت کی روٹیوں پر دن رات کام کرنے والی ملازمہ نہیں ملے گی۔"

وہ ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہوگئیں۔ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اسے گالیاں دینے اور کوسنے لگیں۔ وہ بولا۔ "آپ کے گالیاں دینے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے بھائی جان دن رات ثمینہ کو بیٹی کہتے ہیں۔ کیا انہوں نے سردیوں میں ٹھٹھرتی ہوئی راتوں میں اپنی کسی بیٹی سے کہا ہے کہ وہ آدھی رات کو اٹھ کر بچے کا دودھ بنالائے اور اس کے غلیظ پوتڑے دھولیا کرے۔"

بڑے بھائی جان بھی طیش میں آگئے۔ آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔ اسے گالیاں دیتے ہوئے مارنے لگے۔ دونوں بزرگوں نے بڑی مشکل سے انہیں الگ کیا۔ وہ ہانپتے ہوئے کہنے لگے۔ "یہ کم ظرف اور کمینہ یہاں نہیں رہے گا۔ آپ بزرگوں نے اس کی ڈھٹائی آنکھوں سے دیکھ لی ہے۔ اسے فوراً گھر سے نکل جانے کا حکم دیجئے۔"

خالد نے کہا۔ "یہاں خاندان کے تمام بزرگ آجائیں تب بھی میرے باپ کے گھر سے مجھے نہیں نکال سکیں گے۔"

منجھلے بھائی جان نے کہا۔ "ہم ایک گندی مچھلی کو تالاب سے ضرور نکال کر رہیں گے۔"

"میں چھوٹا ہوں۔ آپ لوگوں کی عزت کرتا ہوں۔ چپ چاپ سر جھکا کر مار کھ لیتا ہوں لیکن مجھے میرے حق سے محروم کرنے کی سازش کی گئی تو پھر میں کسی کی عزت نہیں کروں گا۔"

بڑے بھائی جان نے بزرگوں سے کہا۔ "آپ میرے ساتھ آیئے۔ آج میں اباجان سے آخری فیصلہ کراؤں گا۔"

وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر گئے۔ ان کے پیچھے سب ہی اسٹور روم میں پہنچ گئے۔ دونوں بزرگ چارپائی پر صمد یار خان کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک نے کہا۔ "صمد بھائی! تمہارے گھر میں تباہی آرہی ہے' اسے بچالو۔"

صمد یار خان نے خان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

بڑے بیٹے احمد یار خان نے جیب سے ایک اسٹامپ پیپر نکال کر اسے کھولا۔ پھر باپ کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "اس میں ہم نے لکھایا ہے کہ آپ اپنے چھوٹے بیٹے خالد یار خان کو عاق کررہے ہیں۔ آج سے وہ آپ کا بیٹا ہے نہ آپ اس کے باپ ہیں۔ آپ پورے ہوش وحواس میں رہ کر خالد کو اپنی جائیداد سے محروم کررہے ہیں۔ آج کے بعد خالد اس مکان میں سے کوئی حصہ نہیں مانگے گا۔ آپ اسے گھر سے نکال رہے ہیں۔"

خالد سختی سے ہونٹوں کو بھینچ کر یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ دونوں بھائی اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکنے کی سازش پہلے ہی کرچکے ہیں۔ بڑے بھائی جان احمد یار خان اسٹامپ پیپر کی تحریر چبا چبا کر پڑھ رہے تھے اور اونچی آواز میں انہیں سمجھاتے بھی جارہے تھے۔ پھر انہوں نے باپ کے ہاتھ میں قلم دیا اور کہا۔ "یہاں دستخط کردیں۔"

باپ نے پوچھا۔ "کیا اسے عاق کردوں؟ خون کے رشتے سے کاٹ دوں؟"

"جی ہاں کاٹ دیجئے۔"

"اسٹامپ پیپر کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ہی تم دونوں بیٹوں نے مجھ سے خون کا رشتہ ختم کردیا ہے۔ عید کے دن بھی سلام کرنے نہیں آتے ہو۔ میں کس

عدالت میں جاکر فریاد کروں؟ یہ میرا گھر ہے مگر مجھے اسٹور روم میں اور صحن میں پھینک دیا ہے' خالد بھی ایک طرف پڑا رہتا ہے۔ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ ارے بدنصیب بھائیو! تم یوسف کو خود غرضی کے کنویں میں کب تک پھینکتے رہو گے؟"

وہ کھانس رہے تھے' ہانپ رہے تھے اور بول رہے تھے۔ ایسی حالت میں ان کی آدھی بات سمجھ میں آتی تھی اور آدھی پلے نہیں پڑتی تھی۔ ویسے بات آدھی ہی کیوں نہ پلے پڑے' شرم والوں کو ہی شرم آتی ہے۔ بڑی بہو نے کہا۔ "بڑے میاں تو تقریر کررہے ہیں۔"

بڑے بیٹے نے باپ کے کان کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "ابا جان! ہمارے گھر میں جوان لڑکیاں ہیں' یہ اس قدر آوارہ' بے حیا اور بے غیرت ہوگیا ہے کہ ہم اسے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اگر یہ رہے گا تو ہم سب چلے جائیں گے۔"

"نہیں بیٹے! میں اپنے گھر سے کسی کو جانے نہیں دوں گا' خالد برا نہیں ہے' اس کا وقت برا ہے۔ جب وہ کسی کام کا ہوجائے گا تو تم سب کے کام آئے گا۔"

"ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ آج آپ کو اس گھر کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا۔"

صمد یار خان تھوڑی دیر تک سوچتے رہے۔ سوچنے کے دوران ان کا سر آہستہ آہستہ ہلتا رہا۔ پھر انہوں نے پوچھا۔ "تم لوگ گھر کا فیصلہ کرانا چاہتے ہو یا خالد کا؟"

منجھلے بیٹے نے کہا۔ "بات ایک ہی ہے۔ ہم آوارہ بدمعاش بھائی کو گھر سے نکالنا چاہتے ہیں۔"

انہوں نے تھرتھراتی.......... ہوئی نحیف سی آواز میں کہا۔ "اس کا ایک ہی طریقہ ہے تم تین بیٹے ہو۔ گھر کے تین حصے دار ہو۔ تم دونوں خالد کو راضی کرکے اس کا حصہ خرید لو' میں بھی خالد کو سمجھاتا ہوں۔ اس کے حصے کی اچھی خاصی رقم ملے گی تو وہ کوئی چھوٹا موٹا سا کاروبار کرے گا۔ بے روزگاری اور محتاجی کی لعنت ختم ہوجائے گی۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "واہ' کیا دانشمندانہ مشورہ دیا ہے۔ آخر صمد بھائی نے ہم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ یہ کسی بیٹے کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ چھوٹا بیٹا گھر سے بے گھر ہوگا تو اس کے پاس چار پیسے کمانے کے لئے ایک بڑی رقم ہوگی؟"

دوسرے بزرگ نے کہا۔ "یہ تو مکان کی قیمت لگانے سے معلوم ہوگا۔"

"ہم اسے فروخت کرنے نہیں جارہے ہیں۔ پھر قیمت کیسے لگائیں؟"

"فروخت کرنا ضروری نہیں ہے۔ دو چار اسٹیٹ ایجنسی والوں سے قیمت اندازہ ہو جائے گا۔"

دونوں بھائیوں کو چپ سی لگ گئی۔ وہ چند لمحوں تک ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے پھر بڑے بھائی احمد نے منجھلے بھائی اسد سے کہا۔ "ذرا ادھر آؤ۔"

وہ اٹھ کر اسٹور روم سے باہر آگئے۔ ان کی بیویاں بھی پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ احمد نے کہا۔ "ابا جان نے بات کہاں سے کہاں پہنچادی ہے۔ میرا خیال ہے' ہمیں صبر کرنا چاہئے۔ ہم بعد میں زبردستی اس کاغذ پر دستخط کرالیں گے۔"

احمد کی بیگم نے کہا۔ "میری مانیں تو بڑے میاں کو دو وقت کی روٹی نہ دیں تیسرے وقت وہ خود دستخط کردیں گے۔"

"بکواس مت کرو۔ ہم اپنے باپ پر ظلم نہیں کرسکتے۔ سمجھا منا کر کام نکال ہیں۔"

"یہ تو میں لکھ کر دے سکتی ہوں۔ بڑے میاں راضی خوشی کبھی خالد کو عاق نہ کریں گے۔"

منجھلی بہو نے پوچھا۔ "آخر اس مکان کی قیمت کیا ہوگی؟"

"کم از کم چھ لاکھ روپے ہوگی۔"

"یعنی خالد کو اس گھر سے نکالنے کے لئے دو لاکھ روپے دینے ہوں گے۔"

"ہاں دو لاکھ اور ہمارے گھر سے ابھی دو ہزار روپے نہیں نکلیں گے۔"

سب کو چپ لگ گئی۔ خالد دور اسٹور روم کے دروازے پر کھڑا انہیں دیکھ تھا۔ ان کی باتیں سنائی نہیں دے رہی تھیں مگر ان کی الجھن سمجھ میں آرہی تھی۔ لوگ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کچھ نہ کچھ بول رہے تھے۔ انہوں نے جیسے کھائی تھی کہ آج اسے گھر سے نکال کر ہی رہیں گے۔

آخر بڑے بھائی نے خالد کو ہاتھ کے اشارے سے مخاطب کیا۔ "اے' میرے کمرے میں آؤ۔"

وہ اپنی پوری ٹیم کے ساتھ کمرے میں گئے۔ خالد دروازے پر آیا۔ ایک بھا

نے کہا۔ "اندر آؤ۔"

وہ اندر آیا۔ دوسرے بھائی نے کہا۔ "ہم اس جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتے کہ مکان میں کس کا کتنا حصہ ہوگا۔ ہم میں سے کوئی کسی کو اس کے حصے کی رقم ادا نہیں کرسکتا۔ ہمیں ابا جان کی یہ بات پسند آئی کہ تمہیں گھر سے نکلنے کے بعد کاروبار کرنے کے لئے کچھ رقم کی ضرورت ہوگی اور یہ ہم دے سکیں گے۔"

"بھائی جان! آپ نہیں دے سکیں گے۔"

"بے شک' ہم اس مکان کی قیمت کے مطابق تمہارے حصے کی رقم نہیں دے سکیں گے لیکن تمہیں کاروبار کرنے کے لئے کچھ تو دے سکتے ہیں۔"

خالد مسکرانے لگا۔ بڑی بھابی نے کہا۔ "تمہارے بھائی کی تنخواہ سے پھوٹی کوڑی نہیں بچتی۔ میں نے کسی طرح بیسی ڈال کر پانچ ہزار کا ایک نیکلس بنوایا تھا۔ اسے بیچ کر جو رقم آئے گی' تمہیں دے دوں گی۔"

منجھلی بھابی نے کہا۔ "پانچ ہزار میں دے دوں گی۔ سب ملا کر دس ہزار ہو جائیں گے' یہ کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔"

ایک بھائی نے کہا۔ "تم کہیں بھی فٹ پاتھ پر ریڑھا لگا کر خوب کما سکتے ہو۔"

دوسرے بھائی نے کہا۔ "کراچی کے فٹ پاتھ پر دکانداری کرنے والے ہزاروں لاکھوں روپے کما لیتے ہیں۔ یہ مکان کیا چیز ہے' تم محنت کرو گے تو شاندار کوٹھی بنا لو گے۔"

وہ چپ چاپ کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ کبھی وہ بول رہے تھے کبھی ان کی عورتیں بول رہی تھیں۔ سب ہی اس بات پر زور دے رہے تھے کہ وہ دس ہزار روپے لے کر اس گھر سے نکل کر دنیا کا امیر ترین آدمی بن سکتا ہے۔ آخر وہ بولتے بولتے چپ ہوگئے۔ ایک بھائی نے پوچھا۔ "تم خاموش کیوں ہو؟ ہم تمہاری بھلائی کی بات کررہے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "آپ مجھے گھر سے نکالنے کے لئے اباجان سے دستخط نہ کراسکے۔ اب دس ہزار میں پورا مکان ہڑپ کرنا چاہتے ہیں۔ جب آپ لوگوں کا خون سفید ہوچکا ہے تو پھر مکان کی کھری قیمت معلوم کی جائے گی اور اس میں اپنے حصے کی کھری رقم وصول کروں گا۔"

بڑے بھائی نے غصے سے پوچھا۔ "تم اپنی کمینگی سے باز نہیں آؤ گے؟"

"اگر میں کمینہ ہوتا تو ایسا ہی ایک اسٹامپ پیپر آپ کے خلاف لکھوا کرایا جا
کے پاس پہنچ جاتا۔"

بڑی بھابی نے اپنے میاں سے کہا۔ "اجی کچھ سن رہے ہیں۔ کچھ سمجھ بھی رہے
ہیں۔ یہ آپ کو کمینہ کہہ رہا ہے۔ توبہ توبہ اسے کہتے ہیں حرام خوری۔ ہمارا کھاتا ہے
اور ہمیں گالیاں دیتا ہے۔"

بڑے بھائی نے طیش میں آکر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "حرام خور' ذلیل'
کمینے تو مجھے گالی دے رہا ہے۔ میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

اس نے قریب پہنچتے ہی مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ خالد نے بائیں ہاتھ سے کلائی
پکڑلی۔ دایاں ہاتھ جیب میں ڈال کر چاقو نکالا۔ پھر اسے ایک کھٹاکے سے کھولا۔
عورتوں کے حلق سے چیخیں نکل گئیں۔ منجھلے بھائی نے دور ہی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے
کہا۔ "نن............ نہیں............ یہ............ یہ تمہارے بھائی جان ہیں۔"

چاقو کو اس قدر قریب دیکھ کر بڑے بھائی جان کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ وہ ایک دم
سے ٹھنڈے پڑ کر بولے۔ "ارے بیٹا خالد! تم بھائی ہو مگر بیٹے جیسے ہو۔ شریف خاندان
کے چشم و چراغ ہو۔ غنڈوں کی طرح چاقو مت نکالو۔ اسے جیب میں رکھ لو۔"

خالد نے کلائی چھوڑ دی۔ پھر کہا۔ "آج سے پہلے میں نے کبھی زبان درازی نہیں
کی۔ آپ لوگوں نے گالیاں دیں' میں نے گالیاں سن لیں۔ آپ لوگوں نے مارا میں
نے مار کھائی۔ شریف گھرانوں میں یہی ہوتا ہے چھوٹے اپنے بڑوں کے آگے ہر حال
میں سر جھکاتے ہیں لیکن آج آپ کے ایک اشامپ پیپر نے مجھے سمجھا دیا کہ آپ لوگ
شریف خاندان سے ضرور تعلق رکھتے ہیں لیکن شریف نہیں ہیں اور جو شریف نہیں
ہوتے' ان سے بدمعاشوں کی زبان میں بات کی جاتی ہے۔"

عورتوں کی چیخیں سن کر گھر کی جوان بیٹیاں' بیٹے اور دونوں بزرگ آگئے تھے۔
ایک بزرگ نے کہا۔ "بیٹے خالد! یہ کیا حرکت ہے؟ تم چاقو دکھا کر ڈرا رہے ہو؟"

خالد نے پوچھا۔ "ماموں جان! کوئی آپ کا گھر لوٹنے آئے تو آپ کیا کریں گے'
یہ لوگ بھی آپ کے سامنے صرف یہ مکان ہی نہیں' میرے باپ کے خون کا رشتہ بھی
مجھ سے چھین رہے تھے۔ اس وقت آپ لوگ خاموش تھے لہٰذا اب بھی خاموش

رہیں۔"

دونوں بھائی اور ان کی بیگمات کمرے کے ایک گوشے میں چلی گئی تھیں۔ ان کی
جوان لڑکیاں اور لڑکے جلدی سے آکر والدین کے سامنے ڈھال بن گئے تھے اور خالد
سے کہہ رہے تھے "چچا جان نہیں چچا جان' آپ تو بہت اچھے ہیں۔ ہم سب آپ کی
عزت کرتے ہیں۔ آپ چاقو نہ نکالیں۔ پلیز اسے رکھ لیں۔"

خالد نے کہا۔ "میرے بچو! مجھے چاقو نہیں نکالنا چاہئے کیونکہ شریف گھرانوں میں
چاقو کے بغیر ہی خون کے رشتے کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ تمہاری آنکھوں پر اپنے
والدین کی محبت کی عینک ہے۔ اس عینک سے میں بدمعاش نظر آؤں گا لیکن یہ بدمعاش
تمہیں یقین دلاتا ہے کہ یہ چاقو آج نہیں چلے گا' اب یہ اُس دن چلے گا جس دن یہ
میرے خلاف دوسری بار سازش کریں گے۔"

بڑے بھائی کے بڑے بیٹے نے کہا۔ "ابو! اب ہم بچے نہیں رہے۔ اس گھر میں جو
کچھ ہو رہا ہے' اسے اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ آپ ایسا راستہ کیوں نہیں اختیار
کرتے کہ تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔"

منجھلے بھائی کے بیٹے نے کہا۔ "تمام جھگڑوں کو ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ یہ
طریقہ آپ بڑے بھی جانتے ہیں۔ ہم نوجوان بھی جانتے ہیں بلکہ گھر کا بچہ بچہ جانتا ہے۔
یقین نہ ہو تو گڈو رانی سے پوچھ لو۔"

اس نے آٹھ برس کی ایک بچی سے پوچھا۔ "بولو گڈو رانی! ہمارے گھر میں کس
کی شادی ہوگی؟"

بچی نے خوشی سے اچھل کر تالی بجائی پھر کہا۔ "چچا جان اور خالہ جان کی شادی
ہوگی۔"

بڑی بھابی جان اسے مارنے کے لئے دوڑیں۔ "اِدھر آ کمبخت' شادی نہیں'
میں تیرا جنازہ نکالتی ہوں۔"

بڑے بیٹے نے گڈو رانی کو اپنے بازوؤں میں چھپاتے ہوئے کہا۔ "اسے مار کر
آپ سچائی کو نہیں مار سکتیں۔ یہ غصے کا وقت نہیں' عبرت کا مقام ہے۔ بزرگ سمجھتے
ہیں کہ گھر کی چار دیواری میں جو ہوتا ہے' اسے بچے نہیں سمجھتے۔ یہ سمجھتے ہیں لیکن صحیح
کو غلط اور غلط کو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ صحیح بات سمجھانا آپ کا فرض ہے............ اگر چچا

جان اور خالہ جان کی شادی ہوگی تو اس بچی کی سمجھ درست ہوگی۔ اگر شادی نہ ہوئی تو ہم پوچھیں گے کہ ان کا رشتہ غلط کیوں ہے؟ اگر غلط ہے تو یہ دونوں برسوں سے ایک ہی چھت کے سائے میں کیوں ہیں؟ آپ لوگوں نے ہم بچوں کو اس غلط ماحول میں کیوں رکھا؟ امی جان! اس ماحول کو غلط قرار دینے سے بہتر ہے آپ ان کی شادی کر دیجئے۔"

"میاں صاحبزادے! بڑی بڑی باتیں کرنے سے زبان نہیں گھِستی لیکن سوچے سمجھے بغیر کوئی بڑا کام کرنے سے زندگی برباد ہو جاتی ہے۔ کیا تم اپنی بہن کی شادی کسی ایسے نکمّے سے کرسکتے ہو جو اپنے رشتے داروں سے مانگ کر کھاتا ہو؟ جہاں نوکری کرنے جاتا ہو' وہاں سے نکالا جاتا ہو؟"

خالد نے کہا۔ "اس کا جواب میں دیتا ہوں۔ میں نے ایسی نوکریاں خود چھوڑ دیں۔ جہاں در پردہ غلط دھندے ہوتے تھے۔ اگر وہ پکڑے جاتے اور ان کے ساتھ میں بھی جیل جاتا تو آپ لوگوں کے سر شرم سے جھک جاتے۔ اللہ کی قسم! میں مجبور اور بے بس نہیں ہوں۔ میرے ضمیر نے مجھے بے روزگار بنا رکھا ہے ورنہ آپ لوگ مہینے میں ہزار کماتے ہیں' میں لاکھوں کما سکتا ہوں۔"

ایک بھائی نے کہا۔ "جب ہم تمہاری طرح بے کار تھے تو اسی طرح خیالی محل میں بیٹھ کر لاکھوں روپے گنتے رہتے تھے۔ میاں ہوش کی باتیں کرو۔"

"میں ہوش میں ہوں اور آپ سے پوچھتا ہوں اگر میں ملازمت کرلوں یا کوئی کاروبار شروع کردوں اور یہ ضمانت دے دوں کہ ثمینہ کو کبھی بھوکا نہیں رکھوں گا۔ اچھا کھلاؤں گا۔ اچھا پہناؤں گا تو کیا آپ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں گے؟"

"ہرگز نہیں۔" بڑی بھابی جان نے ایسے کہا جیسے پتھر کھینچ کر مارا ہو۔

بڑے بھائی نے ڈانٹ کر کہا۔ "بیگم! تم خاموش رہو۔"

"کیوں خاموش رہوں۔ وہ میری بہن ہے' میں جہاں چاہوں گی' اس کی شادی کروں گی۔"

خالد نے کہا۔ "آپ کی ہٹ دھرمی کو یہ بچے اچھی طرح سمجھ رہے ہیں۔ ابھی آپ کے جوان بیٹے نے کہا ہے کہ اس ماحول کو غلط قرار دینے سے بہتر ہے ہماری شادی کردی جائے لہٰذا یہ شادی ضرور ہوگی۔ مجھے کچھ کرنے اور اچھی طرح پاؤں جمانے کے لئے کم از کم تین برس لگیں گے۔ میں جب تک اس قابل نہیں ہو جاؤں گا

تب تک اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔"

بڑی بھابی جان خالد کا یہ چیلنج سن کر طیش میں آرہی تھیں کہ یہ شادی ضرور ہوگی لیکن جب یہ سنا کہ وہ لمبی مدت کے لئے گھر سے جا رہا ہے تو دل کی مراد بر آئی۔ دماغ نے سمجھایا' پہلے اس بدمعاش کو دفع ہونے دو پھر دیکھا جائے گا۔

خالد نے کہا۔ "آج ہمارے بچوں نے ہمیں سمجھا دیا ہے کہ یہ نادان نہیں ہیں' میں بھی انہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ میں غلط نہیں ہوں۔ چونکہ ابھی ثمینہ کے قابل نہیں ہوں۔ اس لئے گھر سے جا رہا ہوں۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر اپنے بچوں کے ماحول کو غلط نہیں کرنا چاہتا۔ اسے صحیح کرنے کے لئے کسی قابل ہو کر آؤں گا۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا درمیانی میز کے پاس آیا۔ پھر بولا۔ "میں بڑی شرافت اور سکون سے یہ گھر چھوڑ رہا ہوں لیکن آپ لوگوں نے اگر تین برس تک میرا انتظار نہ کیا اور ثمینہ کی شادی کسی اور سے کرنے کی حماقت کی تو............"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ایک جھٹکے سے چاقو کی نوک کو درمیانی میز کے سینے میں پیوست کردیا۔ پھر سینہ تان کر چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ وہاں سب پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ سب کی نظریں چاقو پر تھیں۔ بعض حالات میں جو بات شرافت کی زبان سے ادھوری رہ جاتی ہے' بدمعاشی کی زبان اسے مکمل کردیتی ہے۔

☆------☆------☆

ظہیر سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ بڑے بھائی اس کے سامنے غصے سے ٹہل رہے تھے' گرج گرج کر کہہ رہے تھے۔ "تم ہماری عزت اور شہرت کے دشمن ہو۔ تم چاہتے ہو' ہم شریف اور معزز لوگوں سے منہ چھپاتے پھریں۔ جانتے ہو کل سے تمہاری بھابی نے کھانا نہیں کھایا۔ رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔"

بھابی نے اپنی خشک آنکھیں رومال سے پونچھیں۔ پھر زور دار آواز سے ناک صاف کی۔ اس کے بعد کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ مسز چوہان کے ہاں ڈنر میں جاؤں گی تو میرا خون خشک ہو جائے گا۔ وہاں آمنہ نوکرانی کا کام کر رہی ہے' یہ مجھے پہلے کیوں نہ بتایا' کیا تم اتنے گر گئے ہو کہ اب تمہاری بیوی دوسروں کے ہاں کھانا پکانے اور برتن دھونے کا کام کرنے لگی ہے۔"

ظہیر نے کہا۔ "کوئی جان بوجھ کر نہیں گرتا ہے۔ حالات اسے گرا دیتے ہیں۔ آمنہ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کل رات چوہان صاحب کے ڈنر میں تھیں۔ اب میں اپنی بیوی کی تعریف کیا کروں۔ آپ خود اس بات کی گواہ ہیں کہ اس نے سب کے سامنے آپ کو بھابی نہیں' بیگم صاحبہ کہہ کر مخاطب کیا اور یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ آپ جیسے بڑے لوگوں سے ہمارا خون کا رشتہ ہے۔"

بڑے بھائی نے کہا۔ "طعنہ کیا دیتے ہو۔ بے شک' ہم بڑے لوگ ہیں۔ ہم نے اپنی محنت اور صلاحیتوں سے یہ مقام حاصل کیا ہے مگر تمہارے جیسے رشتے دار ہمیں اپنے مقام سے گرانے کی حماقتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"یہ آپ کا بڑا پن ہے کہ آپ ہمیں رشتے دار سمجھتے ہیں۔"

"دیکھو' میں وارننگ دے رہا ہوں' مجھ سے طنزیہ لہجے میں گفتگو نہ کرو۔ اپنی اوقات کو سمجھو۔"

"میری اوقات یہی ہے کہ میں اپنے بھائی کے گھر سامنے والے دروازے سے

نہیں آسکتا۔ پچھلے دروازے سے آتا ہوں۔ تاکہ سائیکل پر آنے والا یہ پروفیسر آپ کا رشتے دار نہ سمجھا جائے۔ جب ہم دنیا والوں کی نظروں میں آپ کے رشتے دار نہیں تو آپ کو آمنہ پر غصہ کیوں آ رہا ہے؟"

"میرے پروفیسر بھائی! دنیا کو پڑھاتے ہو۔ تھوڑا خود بھی پڑھ لیا کرو۔ ایک گھر کا راز ملازموں کے ذریعے دوسرے گھروں تک پہنچتا ہے' آمنہ' مسز چوہان سے بات چھپائے گی لیکن آس پاس کی کوٹھیوں میں کام کرنے والی عورتیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ اگر کوٹھیوں کے سامنے ملاقات نہ ہو تو بس کے اڈے پر ضرور ملتی ہیں۔ بعض کام کرنے والیوں کی منزل ایک ہوتی ہے۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کے گھر کا پتا معلوم کر لیتی ہیں۔ جب کسی کو تمہارے گھر کا پتا معلوم ہو گا تو چوہان صاحب کو یہ اطلاع چونکا دے گی کہ ایک پروفیسر کی بیوی ان کے ہاں آیا کا کام کرتی ہے۔ ابھی ہمارے ہاں پروفیسر کی صحیح تعریف متعین نہیں کی گئی ہے۔ کالا جادو اور سفلی عمل کا دعویٰ کرنے والے بھی خود کو پروفیسر بخاری اور پروفیسر بنگالی کہتے ہیں۔ ان حالات میں چوہان صاحب ضرور تحقیقات کرائیں گے کہ تم کالج کے پروفیسر ہو یا کالے جادو کے؟ کیا تحقیقات کے دوران یہ انکشاف نہیں ہو گا کہ تم ہمارے بھائی ہو؟"

بھابی نے کہا۔ "آپ اتنی لمبی چوڑی تحقیقات کی بات کر رہے ہیں۔ سیدھی بات ہے کہ چھوٹے لوگوں کے پیٹ میں کوئی راز نہیں رہتا۔ اگر کوٹھی کی مالکن کبھی اچھے موڈ میں ملازمہ سے بات کرنے بیٹھ جائے تو ملازمہ پھیل جاتی ہے' اپنے خاندان کا کچا چٹھا سنا دیتی ہے یا دوسرے ملازموں کے درمیان ڈینگیں مارتی ہے کہ اس کے بھائی یا بہنوئی یا دیور بیرسٹر ہیں' جج ہیں' کمشنر ہیں یا منسٹر ہیں۔"

"آمنہ کو ڈینگیں مارنے کی عادت نہیں ہے۔ وہ ایسے سچ کو بھی چھپا رہی ہے جس سے آپ لوگوں کی توہین ہوتی ہے۔"

"ہماری عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو اسے گھر پر بٹھا کر رکھو۔"

"آمنہ کو ماہانہ ڈیڑھ ہزار روپے ملتے ہیں۔ ہمیں روپوں کا لالچ نہیں ہے۔ بیٹیوں کے لئے ضرورت ہے۔ ہم نے چھ ماہ میں نو ہزار روپے بچائے ہیں۔ اتنی بڑی بچت سے ہمیں حوصلہ ہو رہا ہے کہ انسان چاہے تو محنت و دیانت سے حالات پر قابو پایا جا سکتا ہے۔"

"حالات پر قابو پانے کے لئے اپنی سطح سے نہیں گرنا چاہئے۔"

ظہیر نے کہا۔ "میں پروفیسر ہوں مگر یہ پاکستانی معاشرہ میری سمجھ میں نہیں آتا میرے ایک بھائی نے رشوت لی۔ اس کی وردی اتر گئی۔ انہوں نے پچیس ہزار روپے جرمانہ ادا کیا۔ جیل ہو کر آگئے اس کے باوجود وہ آپ کے بنگلے میں سامنے والے دروازے سے آتے ہیں' اس لئے کہ وہ ہنڈا اکارڈ میں آتے ہیں۔ ڈیفنس میں رہتے ہیں اور ایک بہت بڑی سیاسی پارٹی کی طرف سے الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔ لہذا وہ اپنی سطح سے نہیں گرے اور ہم کوئی جرم نہیں کرتے کسی الیکشن میں چہرہ بدل کر نہیں آتے۔ ایمانداری سے محنت کرتے ہیں پھر بھی آپ لوگ ہمیں اپنی سطح سے گرا دیتے ہیں۔"

اس نے ذرا توقف سے کہا۔ "میں مانتا ہوں۔ آدمی کو اپنے علم' اپنی صلاحیت اور اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ کے مطابق ملازمت کرنا چاہئے۔ میں جانتا ہوں' آمنہ غلط کر رہی ہے۔ آپ بھی مان لیجئے کہ آپ اپنے وسیع ذرائع استعمال کر کے مجھے کوئی پارٹ ٹائم ملازمت دلا دیتے تو آج آمنہ یہ کام نہ کرتی۔ مشکل تو یہ ہے کہ میں کہیں چھوٹی سی نوکری کروں تو آپ انسلٹ محسوس کرتے ہیں کہ آپ جیسے عہدیدار کا بھائی آپ کے سامنے ہاتھ جوڑنے والوں کے ہاں کام کر رہا ہے۔ اب کوئی بتائے کہ ہم کہاں جائیں؟"

"جہنم میں جاؤ مگر آمنہ کو وہاں کام نہ کرنے دو۔"

"وہ وہاں کام نہیں کرے گی تو ہم بچوں سمیت جہنم میں چلے جائیں گے اور ہم جان بوجھ کر ایسی جگہ نہین جائیں گے۔"

"یعنی وہ کام کرے گی۔ یہ تمہاری ضد ہے؟"

"ضد نہیں' ضرورت ہے۔"

"آخر تمہاری ضرورت کتنی رقم سے پوری ہو گی؟"

"ایک بیٹی کے لئے کم از کم پچاس ہزار کا جہیز لازمی ہوتا ہے۔"

"یعنی دو بیٹیوں کے لئے ایک لاکھ روپے۔ یعنی تم ہمیں بلیک میل کر رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ تم آمنہ کو اس کوٹھی سے ہٹانے کے لئے ہم سے ایک لاکھ وصول کرو گے۔"

"میں نے آپ سے ایک پیسہ نہیں مانگا ہے۔ آپ ایک لاکھ کیا دس لاکھ دیں تب بھی میں بھکاری یا بلیک میلر کی طرح ہاتھ پھیلا کر آپ کے دروازے پر نہیں آؤں گا۔ یہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی کہ ہم شیطانی کمائی پر تھوکنے کے بعد ہی رزقِ حلال سے آشنا ہوئے ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بولا۔ "میں یہ وعدہ کر کے جا رہا ہوں کہ میں اور میرے بیوی بچے کسی کے سامنے آپ لوگوں سے رشتے داری ظاہر نہیں کریں گے اور نہ ہی آپ جیسے بھائیوں کے دروازے پر کبھی قدم رکھیں گے۔"

وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ بیگم نے غصے سے اپنے میاں کو دیکھا پھر کہا۔ "ایک دو کوڑی کا پروفیسر باتیں سنا کر چلا گیا۔ آپ خاموش کھڑے ہوئے ہیں۔"

"وہ دو کوڑی کا آدمی ہے۔ اسے حوالات بھیجوں گا یا اسے کوئی سزا دلاؤں گا تو سزا دینے والوں کو ضرور معلوم ہو گا کہ وہ میرا بھائی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا' ایسے رشتے داروں سے کب پیچھا چھوٹے گا۔"

بڑے لوگوں پر مصیبتیں بڑی آتی ہیں چھوٹے لوگوں کو صرف چھوٹے لوگوں کے سامنے چھوٹے چھوٹے رکھ رکھاؤ سے رہنا پڑتا ہے۔ بڑے لوگوں کو بہت بڑے بڑے لوگوں میں رہ کر اپنی عزت اور شان و شوکت کو برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ چھوٹوں کے پاس چھوٹی بیماریاں آتی ہیں جو دو چار پڑیاں کھانے سے چلی جاتی ہیں۔ بڑوں کے ہاں غریب رشتے دار ہائی بلڈ پریشر بن کر آتے ہیں' وہ کسی دوا دارو سے نہیں جاتے۔ کینسر کی طرح آخری دم تک پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

آمنہ نے ہونے والے داماد کے لئے عیدی بھیجی۔ عیدی میں ایک سوٹ کا کپڑا' سویاں' چینی اور میوے کے علاوہ نقد روپے بھی تھے۔ جب احمد یار خان اور اسد یار خان اور ان کی بیویوں نے سنا کہ آمنہ نے اپنی بیٹی کے ہونے والے سسرال میں ایک ہزار روپے کی عیدی بھیجی ہے تو سب حیران رہ گئے۔ ان کے دماغوں میں یہ سوال گونجنے لگا۔ کیا آمنہ آپا اور ظہیر بھائی کے پاس دولت آگئی ہے؟

عورتوں میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ آمنہ آپا کے ہاں جا کر اندر کی بات معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ ایک دن آپا خود ہی میکے والوں سے ملنے آگئیں۔ بڑی بھابی نے پوچھا۔ "آپا! کیا واقعی آپ نے ہزار روپے کی عیدی بھیجی ہے؟"

آمنہ نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیا تم حیران ہو؟"

"کیا یہ حیرانی کی بات نہیں ہے؟ ظہیر بھائی آخر کتنا کما لیتے ہیں؟"

"ہم میاں بیوی دونوں ہی کام کرتے ہیں۔ ہر ماہ ڈیڑھ ہزار روپے بچا لیتے ہیں۔"

"اللہ! ڈیڑھ ہزار روپے کی بچت ہوتی ہے؟ مگر کیسے؟"

"میں ایک کوٹھی میں کام کرتی ہوں۔ وہاں سے جو ملتا ہے' اسے ہم بنک میں جمع کر دیتے ہیں۔"

دوسری بھابی نے پوچھا۔ "آپ کوٹھی میں بھلا کیا کام کرتی ہیں؟"

"بھلا اور کیا کروں گی۔ کھانا پکاتی ہوں۔ برتن دھوتی ہوں اور دوسرے اوپری کام کرتی ہوں۔"

"توبہ توبہ! آپ ایک پروفیسر کی بیوی ہو کر یہ کام کرتی ہیں؟"

بڑے بھائی احمد یار خان نے کہا۔ "آپا! ایسا کام کرنا تو ایک طرف رہا۔ کیا ایسا سوچنے سے پہلے آپ کو اپنے میکے کی عزت کا خیال نہیں آیا۔"

آمنہ نے کہا۔ "عزت کا خیال پہلے کہاں آتا ہے۔ اگر پہلے خیال آنا چاہئے تو تم بھائیوں نے کبھی سوچا کہ آپا کی بیٹیوں کو اپنے گھر بہو بنا کر لانا چاہئے۔ ظہیر کے بھائیوں کے ہاں بھی جوان بیٹے ہیں مگر آپ سب جانتے ہیں کہ ایک پروفیسر اپنی بیٹیوں کو اچھا جہیز نہیں دے سکے گا۔ لہٰذا تم لوگوں نے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا اور جب چھوڑ ہی دیا تو عزت کا دکھڑا کیوں روتے ہو؟"

"آپ محض باتیں بنا رہی ہیں۔ آخر ہمارے ہاں بھی جوان بیٹیاں ہیں۔ کیا ہماری عورتیں کسی کے گھر جا کر برتن مانجھ رہی ہیں؟"

"تم دونوں بھائیوں کے ہاں بیٹیاں ایک ایک اور بیٹے چار چار ہیں۔ تم دونوں نے ایک دوسرے کی بیٹی کو بہو بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہارے سر پر کوئی پہاڑ نہیں ہے۔ میری مجبوریاں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں تو کسی بیٹی کو خاندان سے باہر بیاہ کر دیکھو۔ لڑکے والے ایسے ایسے مطالبات کریں گے کہ تم دن کو نوکری کرنے اور رات کو رکشا چلانے پر مجبور ہو جاؤ گے۔"

بھابی نے کہا۔ "اللہ نہ کرے جو یہ کبھی رکشا چلائیں' کیا آپ بددعا کر رہی ہیں؟"

"تمہاری جتنی عقل ہے' اتنا ہی سمجھ رہی ہو۔ میں بھی اس سے زیادہ نہیں سمجھاؤں گی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بولی۔ "جب تک میرے مسائل حل نہیں ہوں گے' میں یہ کام کرتی رہوں گی اور میں نے سوچا تھا اس وقت تک کسی رشتے دار کے ہاں نہیں جاؤں گی لیکن خالد کے بارے میں سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ یہ پوچھنے آ گئی' وہ کہاں گیا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ اس نے اچانک گھر کیوں چھوڑ دیا؟"

"ہم نے اسے جانے کے لئے نہیں کہا۔ وہ اپنی مرضی سے گیا ہے۔"

"کوئی اپنی مرضی سے ایک ٹھکانا تب چھوڑتا ہے جب دوسرا بنا لیتا ہے تم لوگوں کو اس کے دوسرے ٹھکانے کا علم ہونا چاہئے۔"

"ہم نہیں جانتے' وہ کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔"

"اچھی بات ہے' میں معلوم کر لوں گی۔"

وہ چادر سنبھالتی ہوئی کمرے سے نکلی اور اسٹور روم میں آ گئی۔ "ابا جان' السلام علیکم۔"

باپ نے کھانستے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ اسے دعائیں دینے لگے۔ اس نے پوچھا۔ "خالد کہاں ہے؟"

انہوں نے کان پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "خالد کو پوچھ رہی ہو؟"

"جی ہاں' وہ کہاں ہے؟"

"اللہ جانتا ہے بیٹی! وہ کمان سے نکلا ہے۔ اللہ ہی اسے واپس لائے گا۔"

"آخر وہ کیوں چلا گیا؟"

"ہاں' چلا گیا۔"

"میں پوچھ رہی ہوں' وہ کیوں چلا گیا؟"

"برتن آپس میں ٹکراتے ہیں۔ ایسا سبھی گھروں میں ہوتا ہے۔ وہ ٹکراؤ نہیں چاہتا تھا۔ سمجھدار تھا۔ چلا گیا۔"

وہ کان کے قریب منہ لے جا کر بولی۔ "آپ سچ بات نہیں بتائیں گے؟"

انہوں نے بیٹی کے کان کے قریب منہ لے جا کر پوچھا۔ "کیا مجھے بھی گھر سے نکلوانا چاہتی ہو؟"

آمنہ نے ایک گہری سانس لی۔ چھوٹے بھائی کے خلاف سازش کرنے والے سمجھ میں آگئے تھے لیکن یہ تجسس باقی تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر کیوں گیا؟ جبکہ اس گھر پر اس کا برابر کا حصہ تھا اور وہ اپنا حق چھوڑنے والا لڑکا نہیں تھا۔ اس نے اسٹور روم کے دروازے سے دیکھا۔ ثمینہ ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اٹھائے کچن سے نکل کر اپنی آپا کے کمرے کی طرف جارہی تھی۔ آمنہ نے چارپائی سے اٹھ کر آواز دی۔ "ثمینہ!"

وہ ٹھٹک گئی۔ جلدی سے سلام کرکے بولی۔ "میں مسالہ پیس رہی تھی۔ آپ کو سلام کرنے نہ آسکی۔"

وہ قریب آکر بولی۔ "کوئی بات نہیں۔ میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

"آپا! میں.......... میں کوئی جواب نہیں دے سکوں گی۔"

"پھر بھی اتنا پوچھتی ہوں۔ میرا بھائی تمہارے دل سے تو نہیں گیا ہے نا؟"

یکبارگی اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ آمنہ نے کہا۔ "اری نہیں پگلی! آنسوؤں سے جواب نہ دینا۔ بس میں نے اپنے بھائی کو تجھ میں دیکھ لیا ہے۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔"

وہ چادر سنبھالتی گھر سے چلی گئی۔ ثمینہ چند لمحوں تک ہاتھوں میں ٹرے لئے اسی جگہ کھڑی رہی۔ اپنے آنسوؤں کو روکتی رہی۔ اگر وہ بہنے لگتے تو انہیں پونچھنے کے لئے ہاتھ خالی نہیں تھے۔ گھر والوں کی خدمت کرتے کرتے اس کے ہاتھ بھی پرائے ہوگئے تھے' اپنی ہی آنکھوں تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔

وہ آپا کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ صمد یار خان اسٹور روم سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یوں لگتا تھا جیسے اپنی قبر کے کنارے بیٹھے اپنے گھر کی چہل پہل دیکھ رہے ہوں۔ کوئی انہیں نہیں دیکھتا تھا' دنیا والے قبر کی طرف بھول کر ہی دیکھتے ہیں۔ اتنی فرصت ہی نہیں ملتی۔ بیٹے روز صبح کام پر جاتے تھے۔ شام کو آتے تھے پھر دوسری صبح تک اپنی اپنی بیوی کو خوش رکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ بچے پڑھتے تھے۔ ایک دوسرے سے لڑتے تھے مگر اس سے زیادہ آپس میں محبت کرتے تھے۔ یہی بات صمد یار خان کو دکھ پہنچاتی تھی۔ اگر بیٹے بہو' پوتے پوتیاں کبھی لڑتے ہیں تو ان سے بھی لڑنے آئیں۔ اور جب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو ان سے بھی محبت کرنے آئیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ تین وقت کی روٹیاں دی جائیں اور ایک وقت کی بھی توجہ نہ دی

جائے۔

اس بڑھاپے میں صرف توجہ کی کمی تھی۔ اسی لئے وہ اکثر چارپائی سے اٹھ کر گندی گلی میں آجاتے تھے اور کسی نہ کسی بہانے دوسروں کو متوجہ کرنا چاہتے تھے۔ گلی میں مرد کم نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی عورتیں کچرا پھینکنے کے لئے دروازے پر آتی تھیں۔ انہیں سلام کرتی تھیں۔ پھر دروازہ بند کرلیتی تھیں۔ البتہ دو چار بچے نظر آتے ہی رہتے تھے۔ وہ انہیں دوست بنانے کی کوشش کرتے تھے لیکن بچوں کو کھیلنے سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ ایک جگہ بیٹھے رہنے والے بوڑھے کو نظرانداز کرتے تھے۔ اس بات پر صمد یار خان کو غصہ آتا تھا۔ گھر ہو یا باہر کوئی انہیں پوچھتا نہیں تھا۔ وہ بڑبڑاتے تھے۔ بچوں کو گالیاں دیتے تھے اور چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر مارتے تھے۔ گھر میں کسی کو ڈانٹنے یا مارنے کے حقوق نہیں رہے تھے اس لئے باہر حسرت پوری کرتے تھے۔

ایک دن پتا چلا' سامنے والے کے پڑوس میں نئے لوگ آئے ہیں۔ نئے آنے والوں نے وہ مکان خرید لیا تھا۔ صمد یار خان خوش ہو رہے تھے' اگر ان میں کوئی بوڑھا ہوا تو اس سے دوستی ہو سکتی ہے۔ اس نے ایک جوان کو بلا کر پوچھا۔ "بیٹے! کہاں سے آئے ہو؟"

"کھوکھراپار سے۔"

"تمہارے ابو کیا کرتے ہیں؟"

"صدر میں ہمارا پان سگریٹ کا کھوکھا ہے۔ ہم باپ بیٹے باری باری دکان پر بیٹھتے ہیں۔"

"تمہارے دادا کہاں ہیں؟"

"ان کا انتقال ہوچکا ہے۔"

انہیں مایوسی ہوئی۔ اس نئی فیملی میں ان کی عمر کو سمجھنے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ اپنے دروازے کے پاس چبوترے پر بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ ان کا تمام سامان ٹرک پر لاد کر سامنے والے دروازے سے لایا گیا ہوگا۔ تھوڑا سا سامان گندی گلی سے بھی لایا گیا تھا۔ صمد یار خان دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی ایک مشغلہ تھا۔ وہاں کوئی آتا جاتا ہو یا سامان پہنچایا جارہا ہو۔ یا عورتیں ایک دوسرے سے تو تو میں میں کررہی ہوں تو صمد یار خان کا وقت اچھی طرح گزر جاتا تھا۔ وہ اس گلی کے

باہر کی دنیا کو نہیں جانتے تھے۔ کبھی کبھی خود ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ مثلاً اسی وقت کہیں سے تڑاتڑ گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی تو معلوم ہو گیا۔ شہر میں پھر ہنگامے شروع ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ بھاگتے ہوئے گندی گلی میں آ گئے تھے۔ گلی کے دروازے بھی بند ہو رہے تھے۔ وہ چبوترے سے اٹھ کر اپنے دروازے پر آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے دروازہ بند نہیں کیا۔ ایسے وقت اور تجسس پیدا ہو جاتا ہے کہ دیکھیں "گندی گلی کے باہر والی دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟

اس اعتبار سے وہ خوش نصیب تھے کہ شہر میں پھیلنے والے صوبائی تعصبات کو آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے تھے۔ صرف سن رہے تھے اور یقین کر رہے تھے کہ پنجابی پٹھان اور مہاجر ایک دوسرے کو کچرا سمجھنے لگے ہیں۔ اس شہر پر صرف اپنا ہی حق ؟ کر ہتھیار اٹھاتے ہیں اور جن سے نہ دشمنی ہوتی ہے نہ کبھی کی شناسائی ہوتی ہے انہیں گولی مار دیتے ہیں۔ بازاروں اور دفتروں میں جانے والی مائیں' بہنیں' باپ بھائی اور شوہر اسکول جانے والے معصوم بچے محفوظ نہیں ہیں۔ کہیں بھی کسی وقت بھی کسی کی بھی لاش گرا دی جاتی ہے اور لاش تو کچرے کی طرح ہوتی ہے۔ اس میں تعفن پیدا ہوتا ہے۔ اسے بھی قبرستان کے کوڑا گھر میں ڈال دیا جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے کچرے ہیں' ان میں سب سے زیادہ بدبو' غلاظت اور تعفن انسان کے اندر ہے۔ جب اس کا ذہن جوانی میں بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اس کے حوصلے کھانسنے لگتے ہیں اور اس عمل بلغم تھوکنے لگتا ہے تو اس کے آس پاس اپنی اپنی انا اور اپنی اپنی ذات کی گندی گلی بنتی چلی جاتی ہے۔

دکانیں بند ہو گئی تھیں۔ قطار اندر قطار مکانات کے سامنے والے تمام راستے سنسان ہو رہے تھے۔ لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے اور اندھی گولیوں سے بچنے کے لئے گندی گلیوں سے گزر رہے تھے۔ صمد یار خان نے ایک بوڑھی عورت کو دیکھا' وہ بیٹے اور بہو کا سہارا لے کر گلی میں آ رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ رک رک کر چل رہی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر کھانس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی' شاید وہ آتے آتے صمد یار خان کو صاف طور سے دیکھ رہی ہو گی۔ وہ خوش ہو رہے تھے۔ اس گلی میں ان جیسا نہ سہی' ان کے جیسی آ گئی تھی۔

یہ وہی نئی آنے والی فیملی تھی۔ مکان کے پچھلے حصے میں صحن نہیں تھا۔ ایک

باورچی خانہ تھا اور ایک کمرہ نما چار دیواری تھی۔ جہاں سے زینہ اوپر کو جاتا تھا۔ زینے کے نیچے ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ بیٹے اور بہو نے اس بوڑھی کو چارپائی تک لا کر چھوڑ دیا۔ اس چار دیواری میں کھلی ہوئی چوکھٹ تھی۔ یعنی دروازہ نہیں تھا۔ ایک پھٹا پرانا سا ٹاٹ جھول رہا تھا۔ صمد یار خان اپنے دروازے سے اس چار دیواری کے اندر دور تک دیکھ سکتے تھے۔ بہت عرصے بعد خیال آیا کہ انہیں عینک لگانا چاہئے اور اس دنیا کو صاف طور سے دیکھنا چاہئے۔

وہ دروازے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ چھڑی ٹیکتے ہوئے صحن میں آئے۔ ان کی ایک پوتی اپنی اماں کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی۔ ان کا پوتا پنجوں کے بل اچھلتا ہوا ماں سے پانچ روپے مانگ رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح گھر کے اس بزرگ کو نظرانداز کر رہے تھے اور آج ان حضرت کو بھی کسی کی بے رخی کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اسٹور روم میں آئے۔ اپنی چارپائی پر بیٹھ کر ذرا دم لینے لگے۔ انہوں نے تکیہ اٹھا کر پرانی سی عینک اٹھائی۔ اس کی کمانی ایک طرف سے ٹوٹ گئی تھی۔ ادھر دھاگا باندھ رکھا تھا۔ انہوں نے عینک کو ناک پر رکھا آنکھوں پر سجایا' اس کی ایک کمانی کو ایک کان پر جمایا۔ دوسرے کان پر دھاگے کو لپیٹا تو اسٹور روم کی ہر چیز صاف طور سے دکھائی دینے لگی۔ کچھ لوگ آنکھیں سے دھندلا دیکھتے ہیں۔ عینک لگا سکتے ہیں مگر نہیں لگاتے۔ دنیا کو صاف صاف نہیں دیکھنا چاہتے۔ مایوسی اور ناکامی ساری دنیا سے نظریں چرانے پر مائل کرتی ہے۔ گھر والے اپنے بزرگ کو اپنی توجہ سے مٹاتے تھے اور وہ عینک کے بغیر اپنے بیٹوں اور بہوؤں کو دھندلائے رکھتے تھے۔

وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے اسٹور روم سے باہر آئے۔ تھر تھراتے ہوئے قدموں سے چل رہے تھے صحن سے گزر رہے تھے۔ اچانک ان پر بڑی بہو کی نظر پڑ گئی۔ وہ طنزیہ انداز میں بولیں۔ "واہ آج تو بڑے میاں نے عینک لگائی ہے۔ کیا عید کا چاند دیکھنے جا رہے ہیں۔"

ایک طرح سے بڑھاپا اچھا ہے۔ اس عمر میں اونچا سنائی دیتا ہے' دوسروں کے طعنے سنائی نہیں دیتے۔ وہ کچھ سنے بغیر چھڑی ٹیکتے ہوئے دروازے کے باہر آ گئے' چبوترے پر بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ گلی آخری سرے تک پوری وضاحت سے دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے سر گھما کر اس کھلی ہوئی چوکھٹ کی طرف دیکھا' بوڑھی زینے

کے نیچے چارپائی پر بیٹھی چھوٹے سے ہاون دستے میں کوئی چیز کوٹ رہی تھی۔ آج دور تک دیکھنے والی عینک کام آرہی تھی۔ جب اس نے ہاون دستے سے کوٹا ہوا پان اٹھا کر منہ میں رکھا تو سمجھ میں آگیا' بڑی بی پان کھانے کی شوقین ہیں۔

اس کے بعد وہ کچھ مایوس ہو گئے۔ بڑی بی نے جھک کر ہاون دستے کو چارپائی کے نیچے رکھا تھا۔ پھر اپنی عینک اتار کر سرہانے ڈال دی تھی۔ اب وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتیں تو صمد یار خان دھندلے سے نظر آتے اور یہ مناسب نہیں تھا۔ تعارف دھندلا نہیں' صاف اور مکمل ہونا چاہئے۔ اب تو عینک ایک طرف تھی۔ ایک ہاتھ سے تالی بجانے والی بات تھی اور یہ کبھی بجتی نہیں۔ صرف ایک ہاتھ ہلتا ہے' اگر وہ ہاتھ ہلاتے تب بھی وہ متوجہ نہ ہوتیں۔

وہ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا۔ اندر سے ایک پوتی نے آواز دی۔ "دادا جان' شام ہو گئی۔ سردی لگ جائے گی۔ پہلے ہی کیا کم کھانستے ہیں۔ اندر آجائیں' مہربانی ہو گی۔"

وہ قریب کی آواز مشکل سے سنتے تھے۔ دور کی بھلا کیا سنتے۔ پوتی نے دروازے پر آکر کہا۔ "آپ کے لئے لاؤڈ اسپیکر لگانا ہو گا۔"

اس نے دادا جان کو دیکھا۔ ان کی عینک کا تعاقب کیا تو دور ایک چارپائی میں بڑی بی نظر آئیں۔ پہلے تو وہ حیران حیران سی دیکھتی رہی۔ پھر بے اختیار مسکرانے لگی۔ آہستگی سے بولی۔ "دادا جان' کیا یہ نئے لوگ آئے ہیں؟"

ان کے کانوں میں جوں تک نہ رینگی۔ وہ دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ "دادا جان!"

وہ چونک گئے۔ سر گھما کر دیکھا۔ پھر بولے۔ "سائرہ بیٹی! تم ہو۔"

"جی ہاں' میں ہوں۔ سردی بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ کی قلفی جم جائے گی۔ اندر آجائیں۔"

وہ چبوترے سے اٹھ گئے۔ اٹھتے اٹھتے اُدھر نظر ڈالی۔ بڑی بی نے پھر عینک نہیں لگائی۔ وہ بڑی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ اگر کوئی بڑے میاں ہوتے تو ابھی اس دروازے پر جاکر دوستی کر لیتے۔ ہمارے سماج میں ستر برس کی بوڑھی سے بھی دوستی نہیں ہو سکتی۔ صرف دور ہی دور سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اور صمد یار خان کو ایک انسان کی ضرورت تھی خواہ وہ کسی عمر کا ہو' مرد ہو یا عورت ہو' اعلیٰ ہو یا ادنیٰ ہو۔ بس ایک آدمی ہو جو ان سے بولتا رہے کیونکہ وہ خود آدمی تھے' کسی بولنے والے طوطے سے دوستی نہیں کر سکتے تھے۔

سائرہ اس رات بستر پر لیٹی دادا جان کے متعلق سوچ رہی تھی۔ وہ اسد یار خان کی بیٹی تھی اور اپنے تایا احمد یار خان کے بیٹے فیصل سے منسوب تھی۔ فیصل کی چھوٹی بہن فائزہ اُدھر سائرہ کے بھائی جنید سے منسوب ہو چکی تھی۔ فائزہ نے پوچھا۔ "تم ابھی تک جاگ رہی ہو۔ کیا سوچ رہی ہو؟"

سائرہ نے کہا۔ "تمہارے بھائی مجھے بہت چاہتے ہیں۔ اسی طرح میرا بھائی تمہارا دیوانہ ہے مگر یہ جواں عمر کی باتیں ہیں۔ کیا ایک اسی برس کا بوڑھا کسی بوڑھی عورت کو چاہت اور لگن سے دیکھ سکتا ہے؟"

فائزہ ہنس کر بولی۔ "کیا یہ کیسی کہانی کا پلاٹ ہے؟"

"میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ آج دادا جان ایک بڑی بی کو دیکھنے میں اتنے محو ہو گئے تھے کہ میری آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔"

"کیا سچ کہہ رہی ہو؟"

"میں نے کہا نا مذاق نہیں کر رہی ہوں۔"

"پھر تو یہ بڑا دلچسپ معاملہ ہے۔"

"دلچسپ بھی اور قابلِ غور بھی۔ بڑھاپے میں محبت کرنے کے لئے کیا رہ جاتا ہے؟"

"واقعی یہ بات قابلِ غور ہے۔ آپ کے فیصل صاحب علمِ نفسیات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ اس معاملے پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔"

"تمہارے بھائی سے ملنے کا موقع ہی نہیں مل رہا ہے۔ نہ میری امی کسی عزیز کے ہاں ملنے جاتی ہیں۔ نہ تمہاری۔

"جب سے خالد چچا اور ثمینہ خالہ کے عشق کا چرچا ہونے لگا ہے والدین نے سختی سے ہماری نگرانی شروع کر دی ہے۔"

"یہ والدین سمجھتے ہیں کہ پہرا لگانے سے چوری نہیں ہوتی۔ ہمیں وہی چھت والا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔"

فائزہ کی امی اور ابو اوپری منزل میں رہتے تھے۔ دوپہر کو کھانے کے بعد کبھی سائرہ کی امی اوپری منزل پر جاتی تھیں اور کبھی فائزہ کی امی نچلے حصے میں آکر بیٹھ جاتی تھیں۔ ایسے وقت سائرہ اوپری منزل پر فائزہ سے ملنے جاتی تھی۔ فیصل پہلے ہی دوست سے ملنے باہر چلا جاتا تھا۔ اس طرح ان ماؤں کو اطمینان ہوتا تھا کہ لڑکے لڑکیاں تنہائی میں نہیں مل سکیں گے۔ جوان بچوں کی چالاکیاں ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ پڑوس کے جوان لڑکے' فیصل اور جنید کے دوست اور ہمراز تھے۔ وہ دونوں پڑوس کے دوستوں سے ملنے آتے تھے۔ دوست انہیں اپنے مکان کی چھت پر پہنچا دیتے تھے۔ اِدھر سائرہ اور فائزہ چھت پر آجاتی تھیں۔ یوں مکان کے نچلے حصے میں مائیں جتنی دیر دنیا جہان کی باتوں میں مصروف رہتی تھیں' اتنی دیر اوپر بچوں کو آزادی مل جاتی تھی۔

آزادی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جوان بچے تنہائی میں فلمی رومانس کے لئے یا اپنی غیرت کو داؤ پر لگانے آتے ہیں۔ بے شک' بعض نوجوان بہک جاتے ہیں مگر اکثریت ایسی نہیں ہوتی۔ پھر جنید کے سامنے اس کی بہن سائرہ' فیصل سے ملتی تھی اور فیصل کے سامنے اس کی بہن فائزہ' جنید سے باتیں کرتی تھی۔ دونوں رومانی جوڑے چھت پر ایک دوسرے سے دور رہتے تھے مگر ایک دوسرے کی نظروں میں رہتے تھے۔ شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھنے' آپس میں ملنے اور ایک کو دوسرے کی اسٹڈی کرنے اور مزاج کو سمجھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ آپس میں ہنسنا بولنا اور محبت کے یادگار لمحات گزارنا بری بات نہیں ہے۔

سائرہ نے فیصل کو اور فائزہ نے جنید کو دادا جان کے متعلق بتایا۔ وہ چاروں درمیانی فاصلہ ختم کرکے ایک جگہ آگئے۔ فیصل نے کہا۔ "میں دادا جان کے پرابلم کو سمجھتا ہوں مگر ہم سب اپنی دنیا میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ ان کے پاس بیٹھ کر ان کے حصے کی محبت انہیں دینے کے لئے اپنا وقت ضائع نہیں کرسکتے کیونکہ دن رات پڑھنے یا کام کرنے کے بعد ہمیں بھی محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو وقت میں اور جنید' دادا جان کے پاس گزار سکتے ہیں' وہ ہم سائرہ اور فائزہ کے ساتھ گزاریں گے تو ہمیں اپنے حصے کی محبت ملے گی۔ یعنی ہمارے پاس محبت دینے کا وقت نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم زیادہ سے زیادہ محبت لینے میں مصروف رہتے ہیں۔"

سائرہ نے کہا۔ "جناب ماہر نفسیات صاحب! آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دادا جان

بھی باہر بیٹھ کر اپنے حصے کی محبت حاصل کر رہے ہیں۔"

"ہاں' آدمی روٹی کے بغیر کچھ روز زندہ رہ سکتا ہے۔ محبت کے بغیر بھی زندہ رہے گا مگر محرومی کے پہلے ہی دن سے دماغی مریض بنتا چلا جائے گا۔ دنیا کے نوے فیصد بوڑھے دماغی مریض ہوتے ہیں۔ محبت سے محرومی کے سبب وہ طرح طرح کی بچگانہ حرکتیں کرتے ہیں۔ ہم انہیں سمجھنے کے بجائے کہتے ہیں کہ بڑے میاں کا دماغ چل گیا ہے۔"

جنید نے پوچھا۔ "دادا جان جو کر رہے ہیں' کیا اچھا کر رہے ہیں۔"

"برا کیا کر رہے ہیں؟"

"فیصل بھائی! ابھی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔"

"تو پھر انتظار کرو' بات رفتہ رفتہ سمجھ میں آجائے گی۔"

فائزہ نے کہا۔ "اگر ہمارے والدین کو معلوم ہوگا تو وہ دادا جان کو باتیں سنائیں گے۔"

"پروا نہ کرو۔ انہیں کم سنائی دیتا ہے۔"

"مگر ہم تو سنتے ہیں۔ اگرچہ ہم ان کے پاس بہت کم جاتے ہیں۔ تاہم ان سے محبت تو ہے۔ آخر وہ ہمارے دادا ہیں۔ امی طعنے دے دے کر باتیں سناتی ہیں تو میرا دل دکھتا ہے۔"

"ہم سب کا دل دکھتا ہے۔ وہ ہم سب کے دادا ہیں۔ ہم یہ بات اپنے والدین کو نہیں بتائیں گے اور چوری چھپے دادا جان کی اسٹڈی کرتے رہیں گے کہ ایک بوڑھا شخص محبت کی کمی کو پورا کرنے کے لئے کس حد تک جاسکتا ہے۔"

وہ سب فیصل کی بات سے متفق ہوگئے۔ اس دن سے ان کی نظریں دادا جان کے تعاقب میں رہنے لگیں۔ صمد یار خان ابتدائی چند روز تک دشواری محسوس کرتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بڑی بی کو کس طرح مخاطب یا متوجہ کریں۔ وہ اپنے اندر جھانک کر اچھی طرح یقین کرچکے تھے کہ اس عمر میں آدمی گناہ نہیں کرسکتا۔ کوئی چھچھوری حرکت نہیں کرسکتا۔ "پھر میں کیوں ڈرتا ہوں؟" یہ سوال وہ خود سے کرتے تھے لیکن اُدھر جانے کا حوصلہ نہیں پاتے تھے۔

وہ ایک صبح نیند سے بیدار ہوئے۔ منہ دھونے کے بعد کنگھی اٹھائی۔ پھر ٹوٹا ہوا

آئینہ دیکھ کر مانگ نکالنے لگے۔ پہلے وہ صبح اٹھنے کے بعد منہ نہیں دھوتے تھے۔ آنکھیں تک صاف نہیں کرتے تھے۔ دروازے کی طرف منہ اٹھا کر آواز دیتے تھے۔ "مجھے ناشتا دینے والا' کوئی چائے پلانے والا ہے؟"

اب وہ ناشتا نہیں مانگتے تھے۔ آنکھ کھلتے ہی گلی میں پہنچنا چاہتے تھے۔ خیال آتا تھا' اپنا حلیہ درست رکھنا چاہئے۔ منہ گندا رہے گا بال بکھرے رہیں گے تو وہ کیا سوچے گی؟

انہوں نے کنگھی کرنے کے بعد سرہانے ہاتھ بڑھایا جہاں عینک رکھی رہتی تھی۔ وہ ذرا ٹھٹک گئے۔ عینک کسی رنگین کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے وہ رنگین کپڑا ان کے سرہانے نہیں تھا۔ انہوں نے عینک اٹھا کر دیکھا۔ ایک طرف دھاگا باندھا تو صاف نظر آنے لگا۔ وہ رنگین کپڑا ایک پھولدار چھوٹا سا رومال تھا۔ ایک چھوٹی سی پرچی ایک پن کے ذریعے رومال سے منسلک تھی۔ انہوں نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے پن کو نکال کر ایک طرف رکھا۔ پرچی کو کھول کر دیکھا۔ اس میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

انہوں نے عینک اتار کر پرچی کو آنکھوں کے بالکل قریب کرلیا۔ اسے پڑھنے لگے۔ لکھا ہوا تھا۔ "میں بڑی بی کا رومال ہوں' ان کی چوکھٹ کے سامنے گلی میں پڑا تھا۔ ہوا کا شریر جھونکا مجھے آپ کے سرہانے لے آیا ہے۔ پلیز' مجھے میری مالکہ تک پہنچا دیجئے۔"

صدیار خان کی سانسیں' تیز تیز چل رہی تھیں' دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ابھی ادھر دھیان نہیں جا رہا تھا کہ رومال ہوا سے اڑ کر ان کے پاس کیسے آگیا؟ پھر خود رومال نے یہ پرچی کیسے لکھی؟ ابھی تو اس رومال سے خوشبو کے جھونکے آرہے تھے۔ جس کے دروازے تک جانے کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا' اس کا رومال ہاتھوں میں آگیا تھا۔ وہ مارے خوشی سے تھرتھر کانپ رہے تھے۔ وہ اٹھنا چاہتے تھے مگر لرز رہے تھے۔ خوشی کی انتہا یہ تھی کہ وہاں سے اٹھ کر گلی کے دروازے تک نہیں جاسکتے تھے۔ اگر وہ ایک قدم اٹھاتے تو دوسری طرف پڑتا۔ لڑکھڑا کر رہ جاتے۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک گم صم بیٹھے رہے۔ پھر انہیں ہوش آیا کہ وہ پرچی ان کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے نکل کر کہیں چلی گئی ہے۔

انہوں نے جلدی سے عینک لگائی۔ بیٹھے ہی بیٹھے دور تک نظریں دوڑانے لگے۔

وہ پرچی نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ چارپائی سے بیٹھے بیٹھے کھسک کر فرش پر آئے۔ چاروں طرف نظر دوڑائی وہاں کافی کاٹھ کباڑ پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک ایک چیز ہٹا کر نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ اپنا ہی بوجھ اِدھر اُدھر لے جاتے تھے۔ یہی بہت تھا۔

رومال بستر پر رکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرانے لگے۔ چونکہ دانت نہیں تھے اس لئے مسکراہٹ کے عمل میں منہ کھل جاتا تھا۔ رومال کسی عمدہ سے پرفیوم میں بسا ہوا تھا۔ دور ہی سے خوشبو آرہی تھی انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔ "محترمہ خوشبو کی دلدادہ ہیں' نہایت ہی نفاست پسند خاتون ہیں۔"

انہوں نے رومال کو اٹھایا۔ پھر خود کو فرش سے اٹھانے لگے۔ بدن کا بوجھ بڑھاپے میں محسوس ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح اٹھ کر کھڑے ہو ہی گئے۔ چھڑی کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسٹور روم کے دروازے پر آئے۔ سائرہ نے آواز دی۔ "دادا جان کہاں جارہے ہیں؟ میں ناشتا لارہی ہوں۔"

وہ اپنی دُھن میں صحن سے گزر رہے تھے۔ دونوں بہوئیں صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے نتھنے پھلا کر گہری سانس لی پھر ایک نے کہا۔ "کتنی خوشبو آرہی ہے۔ کیا بڑے میاں پھر سے جوان ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں؟"

دوسری بہو نے کہا۔ "کچھ دنوں سے دیکھ رہی ہوں یہ صاف ستھرے رہنے لگے ہیں۔ بچوں سے دھلے ہوئے' استری شدہ کپڑے مانگ کر پہنتے ہیں۔ صبح شام کنگھی کرتے ہیں اور مستقل عینک لگائے رہتے ہیں۔ آج سے خوشبو لگانا شروع کیا ہے۔ آخر اتنا عمدہ پرفیوم انہیں کہاں سے مل گیا؟"

کھڑکی کے پیچھے کھڑی ہوئی سائرہ نے سرگوشی میں کہا۔ "فائزہ! تم بھید کھول دو گی۔ رومال میں اتنا پرفیوم انڈیلنے کی کیا ضرورت تھی؟"

فائزہ نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ ہماری مائیں صرف بڑبڑا کر رہ گئی ہیں۔ انہوں نے رومال پر توجہ نہیں دی ہے۔"

صدیار خان دروازے کے باہر چبوترے پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگے۔ دور کھلی ہوئی چوکھٹ کے باہر بڑی بی دھوپ کھانے بیٹھی ہوئی تھیں۔ صدیار خان نے سوچا۔ میں مخاطب کروں گا۔ سنو' یہ تمہارا رومال میرے پاس آگیا ہے۔ وہ پوچھے گی۔ یہ تمہارے پاس کیسے پہنچ گیا؟ میں کہوں گا۔ ہوا کا جھونکا لے آیا لیکن یہ ماننے والی بات

نہیں ہے۔ کسی کا رومال اس کے گھر سے دوسرے کے گھر کیسے پہنچ سکتا ہے؟

اب وہ حیران تھے کہ رومال تحریر کے ساتھ ان کے پاس کیسے پہنچ گیا؟ کسی نے پہنچایا ہوگا لیکن کون پہنچائے گا؟ وہ پرچی کس نے لکھی ہوگی؟ یہ سب کچھ غیب سے نہیں ہو سکتا لیکن ایسا ہو چکا ہے۔ میرے دل کا بھید کسی کو معلوم نہیں ہے۔ میں گلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر رکھتا ہوں کوئی مجھے محترمہ کی طرف دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتا۔ آخر یہ رومال کس فرشتے نے مجھ تک پہنچایا ہے؟

یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ وہ رومال بڑی بی کا ہے یا نہیں؟ اگر ان کا ہوگا تو وہ خود ہی بتائیں گی کہ وہ محبت کا پیغامبر ان کے ہاتھ سے نکل کر گندی گلی سے گزر کر میرے بستر تک کیسے پہنچا ہوگا۔

وہ چبوترے سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور پھر چھڑی ٹیکتے ہوئے سوچتے ہوئے قدموں سے قریب پہنچے مگر یہ بھول گئے کہ کیسے مخاطب کرنا چاہئے۔ بڑی بی نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ نظریں ملتے ہی رومال ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ زمین پر گر کر ہوا سے کانپنے لگا جیسے اُڑنے کے لئے پر تول رہا ہو۔ وہ بھی عینک لگائے ہوئے تھیں۔ رومال پر نظر پڑتے ہی جلدی سے بولیں۔ "اے' یہ تو میلا لومال ہے۔"

وہ توتلی تھیں۔ ایک ننھی بچی کی طرح بول رہی تھیں۔ صدیار خان نے پوچھا۔

"یہ تمہارا ہے؟"

"ہاں' میلا ہے۔"

"میلا نہیں' صاف ہے۔"

"میں اس کو گندا نہیں بولتی۔ یہ گندا نہیں ہے۔ میلا ہے میلا۔"

"اچھا سمجھ گیا' تمہارا ہے۔"

وہ رومال کو اٹھانے کے لئے چھڑی کے سہارے جھکے وہ ہوا سے لڑھکتا ہوا ذرا دور چلا گیا۔ وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھے پھر جھکے' پھر رومال اڑ کر دور ہو گیا۔ بڑی بی ہنسنے لگیں۔ اس بار انہوں نے آگے بڑھتے ہی رومال کو پہلے چھڑی کی نوک سے دبالیا۔ پھر جھک کر اٹھالیا۔ بڑی بی نے پوچھا۔ "یہ تمہیں کیسے مل گیا؟"

چونکہ وہ دور تھے' اس کی بات سن نہ سکے۔ قریب آکر رومال دیتے ہوئے بولے۔ "ناچیز کو صدیار خان کہتے ہیں۔"

وہ کان پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "کیا کہتے ہیں؟"

"صدیار خان۔ میرا نام صدیار خان ہے۔"

"اچھا! یال خان ہو۔ میلا نام زلیکا ہے۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ اچھی دھوپ آلہی ہے۔"

وہ خوش ہو کر چوکھٹ کے قریب کراہتے ہوئے بیٹھ گئے۔ چھت پر سے ان کے پوتے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی جاسوسی ہو رہی ہے۔ صدیار خان نے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔ "میرے یہاں بیٹھنے پر تمہارے گھر والے اعتراض نہیں کریں گے؟"

"میلے پاس کوئی نہیں آتا۔ کسی کو اعتلاض نہیں کلنا چاہئے۔"

"میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ ہماری دنیا میں اب کیا رہ گیا ہے؟ چند سانسیں جو کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہیں۔ اگر ایک دوسرے سے باتیں کرتے ہوئے ختم ہو جائیں تو یہ حسرت نہیں رہے گی کہ ہم سے باتیں کرنے والا اور ہماری سننے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو دل نے کہا۔ اب میں تنہا نہیں رہوں گا۔ میری دنیا میں سناٹا نہیں رہے گا۔ ہم دونوں کی آواز اس گلی میں تھرتھراتی رہے گی۔"

"یال خان! کیسی باتیں کلتے ہو؟ ایسی باتیں' ایسی باتیں آدھی صدی کے بعد نہیں اچھے۔"

"تم جیسی باتیں کہو گی' ویسی ہی کروں گا۔ جب سے تم آئی ہو' میں تمہیں تنہا دیکھتا ہوں۔"

"میں بھی تمہیں تنہا دیکھتی ہوں۔"

"زلیکا! ہم زندہ ہیں۔ زندگی میں اپنی اپنی قبر الگ نہیں بنا سکتے۔"

"دیکھو' تم پھل ویسی ہی باتیں کلنے لگے۔"

"میری باتیں غلط نہیں ہیں۔ آدمی کو مرنے کے بعد تنہائی کے قبرستان میں چھوڑا جاتا ہے۔ ہم اس گندی گلی کے قبرستان میں دور دور نہیں رہ سکتے۔ دو گھڑی پاس بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں۔"

"ہاں' باتیں کل سکتے ہیں۔"

وہ دونوں اونچا سنتے تھے۔ اس لئے اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ چھت پر

کھڑے ہوئے جنید نے کہا۔ "پہلے ہم بچے تھے' باتوں کا مفہوم دور تک نہیں سمجھتے تھے۔ آج معلوم ہو رہا ہے کہ دادا جان بہت ہی خوبصورت انداز میں بولتے ہیں۔"

فیصل نے کہا۔ "اگر چھپ چھپ کر کسی انسان کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی برائیوں کے ساتھ بہت سی اچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ آج ہمیں دادا جان کے زخم نظر آ رہے ہیں۔"

"فیصل بھائی! انہیں اونچی آواز میں نہیں بولنا چاہئے۔ ایک پڑوسن دروازہ کھول کر انہیں دیکھ رہی ہے۔"

"دیکھنے دو۔ وہ دونوں معصوم ہیں۔ ان کے اندر کوئی گندی گلی نہیں ہے۔ کوئی ان پر کیچڑ نہیں اچھال سکے گا۔"

سائرہ اور فائزہ گلی کے دروازے پر تھیں۔ انہوں نے پڑوسن کو جھانکتے دیکھ لیا تھا۔ فائزہ جلدی سے دادا جان کے پاس آئی اور بڑی بی کو سلام کیا۔ صمد یار خان نے خوش ہو کر کہا۔ "زلیخا! یہ میری پوتی فائزہ ہے۔"

زلیخا اسے دعائیں دینے لگی۔ فائزہ نے کہا۔ "دادا جان! ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ چلئے۔"

وہ وہاں سے اٹھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں بھوک لگ رہی تھی مگر برداشت کر رہے تھے۔ فائزہ ان کا بازو پکڑ کر اٹھنے کے لئے سہارا دے رہی تھی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ "میں ناشتا کرنے کے بعد آؤں گا۔ تم یہاں رہوگی؟"

اب دھوپ جا رہی ہے۔ میں لحاف میں جاؤں گی۔"

"دو بجے دھوپ ہمارے دروازے پر آتی ہے۔ تم ادھر آجانا۔"

وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے فائزہ کے ساتھ اسٹور روم میں آگئے۔ سائرہ ٹرے میں ناشتا رکھ کر لا رہی تھی۔ اس کی امی نے کہا۔ "آج بڑے میاں کو انڈے کا پوچ اور گھی کے پراٹھے دیئے جا رہے ہیں۔ کیا یہ بڑی بڑی فرمائشیں کرنے لگے ہیں؟"

"امی! آپ خواہ مخواہ دادا جان کے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ میں اپنی مرضی سے یہ ناشتا لے جا رہی ہوں۔"

وہ بیٹی کو گھور کر رہ گئیں۔ دل ہی دل میں سوچا۔ یہ اچانک دادا جان کے لئے اتنی محبت کیسے امنڈ آئی ہے؟

وہ تیزی سے چلتی ہوئی کچن میں آئیں۔ ثمینہ سے کہا۔ "گھر کا خرچ میں چلاتی ہوں۔ ان بچوں کو کیا معلوم' اگر میں اخراجات میں کمی نہ کروں تو ان کے باپ کی کمائی پوری نہیں پڑے گی۔ مہینے کے آخر میں فاقوں کی نوبت آجائے گی۔ آخر یہ انڈے اور پراٹھے کس خوشی میں گئے ہیں؟"

ثمینہ نے کہا۔ "آپا! میں نے منع کر دیا تھا۔ میں چائے اور سوکھی روٹی بھیج رہی تھی' سائرہ نے پپو کو دکان پر بھیج کر پیسوں سے گھی اور انڈا منگوایا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"جی ہاں' فائزہ اور فیصل نے کہا ہے' وہ رات کو اپنے پیسوں سے ایک پاؤ دودھ لایا کریں گے جو دادا جان کو پلایا جائے گا۔"

"یا اللہ! میں کیا سن رہی ہوں۔ کیا لڑکے لڑکیوں کا دماغ چل گیا ہے؟ کیا یہ بڑے میاں کو پہلوان بنانا چاہتے ہیں؟"

ثمینہ مسکرا کر رہ گئی۔ وہ بھی اپنے بھانجے بھانجیوں کے راز میں شریک تھی۔ اس کی آپا تلملاتی ہوئی صحن میں آئی۔ فائزہ کی امی کو آواز دے کر نیچے بلایا۔ وہ اپنے شوہر سمیت آگئیں۔ تمام بچے بھی صحن میں جمع ہونے لگے۔ انہوں نے پوچھا۔ "تم لوگوں کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آ رہے ہیں؟ کیا روز بڑے میاں کو انڈے پراٹھے کھلائے جائیں گے؟ جانتے ہو' گھی اور انڈے کتنے مہنگے ہیں۔ میں نے سنا ہے' انہیں روز دودھ پلانے کا بھی ارادہ ہے۔"

جنید نے کہا۔ "امی! آپ فکر نہ کریں۔ گھر کے اخراجات پر بوجھ نہیں پڑے گا۔ ہم اپنے جیب خرچ سے انہیں کھلا رہے ہیں۔"

"تم سب اپنے اپنے خرچ سے ایک ہفتہ ہی کھلا سکتے ہو۔"

اسد یار خان نے کہا۔ "بھابی! یہ بچے میرے خرچ سے ماہانہ بیس روپے کا مطالبہ کر چکے ہیں۔"

احمد یار خان نے اپنے کمرے سے نکل کر کہا۔ "اور بیگم! میں بھی ماہانہ بیس روپے دینے پر مجبور ہوں۔ سچ پوچھو تو ان بچوں کے جذبات دیکھ کر مجھے شرم آئی۔ میں اپنے باپ کے لئے وہ نہ کر سکا جو یہ اپنے دادا کے لئے کر رہے ہیں۔"

وہ بچوں کو غصے سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ "ماں کے لئے کوئی جذبہ نہیں ہے۔ میں

نے مصیبتوں سے پیدا کیا۔ ایک ایک بچے کو دو دو برس تک دودھ پلایا۔ میرے لئے دل میں درد نہیں ہے۔ کئی دنوں سے آدھے سر کا درد پریشان کر رہا ہے۔ کسی بچے نے جھوٹے منہ نہیں پوچھا۔ نہ بیٹی نے سر میں تیل ڈالا' نہ بیٹے نے سر دبایا۔ کہنے کو سعادت مند بچوں کی ماں کہلاتی ہوں لیکن مرتے وقت کوئی منہ میں پانی نہیں ڈالے گا۔"

وہ بولتی جا رہی تھیں۔ بچے وہاں سے آہستہ آہستہ کھسکتے جا رہے تھے۔ وہ بولیں۔ "اچھی بات ہے میں بھی دیکھتی ہوں۔ یہ چونچلے کب تک ہوتے رہیں گے؟"

ایک ہفتے بعد انہوں نے دیکھا۔ بڑے میاں کے لئے چکن سوپ تیار ہو رہا ہے۔ وہ ثمینہ پر برس پڑیں۔ "یہ مرغی کہاں سے آئی؟"

فیصل نے کہا۔ "تائی اماں! میں آمنہ پھوپھی کے ہاں گیا تھا۔ انہوں نے کہا ہے' وہ اپنے اباجان کے لئے ہفتے میں ایک مرغی بھیجا کریں گی۔"

فیصل ان کا ہونے والا داماد تھا۔ وہ نرمی سے بولیں۔ "بیٹا! پھوپھی کے گھر جا کر مانگنا اچھی بات نہیں ہے۔"

"ہم نے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ صرف یہ بتایا کہ ہم دادا جان کے لئے کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی خوشی سے یہ آفر دی ہے۔ ہم نے سوچا' آپ کے آدھے سر میں درد رہتا ہے۔ چکن سوپ آپ کے لئے بھی بہتر ہو گا۔"

"مجھے تو معاف رکھو۔ جھاڑو برتن کرنے والی کی کمائی اپنے دادا کو ہی کھلاؤ۔"

وہ داماد کو غصہ نہ دکھانے کے باوجود جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں۔ ادھر صمد یار خان حیران تھے مگر اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے کہ پوتے پوتیاں ان کا خیال رکھنے لگے ہیں۔ وہ ہر دوسرے روز گرم پانی لاتی تھیں اور کپڑا بھگو کر ان کا بدن پونچھتی تھیں۔ فیصل' جنید' کامران اور فرمان باری باری ہفتے میں دو بار سرسوں کے تیل سے ان کی مالش کرتے تھے۔ وہ ایک دن انہیں باپ کی موٹر سائیکل پر بٹھا کر آنکھوں کے معائنے کے لئے لے گئے۔ دوسرے دن خوبصورت سے فریم کی نئی عینک آ گئی۔ ان کا حلیہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔ پہلے وہ کچرا سے لگتے تھے۔ اب وہ استری کئے ہوئے اجلے کپڑے پہن کر نئی عینک لگا کر ایک معزز خاندان کے بزرگ دکھائی دیتے تھے۔

ثمینہ کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ کیونکہ لڑکیاں دادا جان کے لئے پراٹھے اور چکن سوپ تیار کرنا اور شامی کباب بنانا سیکھ رہی تھیں اور وہ شوق سے انہیں طرح طرح کے پکوان سکھا رہی تھی۔ اس طرح کام کا بوجھ کچھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ ایک روز ثمینہ نے کہا۔ "فیصل! تم نفسیات پر بہت بولتے ہو۔ ذرا یہ تو بتاؤ۔ صرف چھ ماہ کے عرصے میں ہم سب کے مزاج کیسے بدل گئے۔ ہم دادا جان کو اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟"

فیصل نے کن انکھیوں سے سائرہ کو دیکھا۔ مسکرایا پھر کہا۔ "ہم دادا جان کے پردے میں روز اپنی محبت کو صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ ہم اپنی محبت کو چکن سوپ پلاتے ہیں۔ اسے صحت مند رکھتے ہیں۔ جب دادا جان نئی عینک لگا کر زلیخا کو دیکھتے ہیں تو میں سائرہ کو اپنے بہت قریب محسوس کرتا ہوں۔"

سائرہ شرما رہی تھی۔ ثمینہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم درست کہہ رہے ہو۔ میں نہیں جانتی تمہارے خالد چچا کہاں ہوں گے۔ کیا کھاتے پیتے ہوں گے۔ میں اپنی بھانجیوں کو پکوان سکھاتے وقت محسوس کرتی ہوں جیسے یہ خوراک میری محبت تک پہنچ رہی ہو۔ ہم دادا جان کے آئینے میں اپنی اپنی محبت کے چہروں کو چمکا رہے ہیں۔"

انسان بنیادی طور پر خود غرض ہوتا ہے۔ وہ جو کرتا ہے' اپنے لئے کرتا ہے۔ مگر اس کی خود غرضی دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے۔ اگر کسان کے پاس اپنا پیٹ نہ ہو تو وہ ہل نہ چلائے' اناج نہ اگائے' دنیا کا پیٹ نہ بھرے۔ ٹیکسٹائل مل کے مالک کو منافع نہ ملے تو وہ دنیا والوں کو کپڑا نہ پہنائے۔ سب ہی اپنے پیٹ کے لئے' منافع کے لئے اور جذبوں کی تسکین کے لئے عملی قدم اٹھاتے ہیں۔ اپنی مرضی پوری کرتے ہیں تو دوسروں کا بھی بھلا ہوتا رہتا ہے۔

اب گندی گلی کی کتنی ہی کھڑکیاں اور دروازے دو وقت کھلنے لگے تھے۔ سردی کے موسم میں زلیخا کے دروازے پر دن کے گیارہ بجے تک دھوپ رہتی تھی۔ پھر دو بجے سے چار بجے تک صمد یار خان کے دروازے پر دھوپ ملتی تھی۔ اسی طرح گرمی کے موسم میں صمد یار خان کے دروازے پر دن کے گیارہ بجے تک سایہ رہتا تھا۔ زلیخا کے چبوترے پر آ جاتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد صمد یار خان' زلیخا کے پاس آتے تھے' وہاں شام تک چھاؤں ملتی تھی۔

سال بھر میں یہ ٹائم ٹیبل محلے کی عورتوں کو معلوم ہو گیا تھا۔ گھر کی چار دیواری میں رہنے والیوں کو تو کوئی مشغلہ چاہئے۔ جب ان کا جی چاہتا تھا' دروازہ کھول کر تماشا دیکھتی تھیں یا کھڑکی سے جھانک کر معلوم کرتی تھیں کہ بڑے میاں اور بڑی بی کیا کر رہے ہیں؟

کوئی پڑوسن پوچھتی تھی۔ "اے بہن! میری کھڑکی سے وہ نظر نہیں آ رہے ہیں۔ ضرور بڑی بی کے پاس ہوں گے۔"

دوسری جواب دیتی تھی۔ "ہاں' آج بڑے میاں شامی کباب لاکر کھلا رہے ہیں۔"

ان بوڑھوں کے لئے یہ اچھی بات تھی کہ انہیں کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ دونوں اپنے آپ میں مگن رہتے تھے' صمد یار کی پوتیاں کھانے کے لئے جو خشک چیزیں ان کے لئے تیار کرتی تھیں' وہ انہیں چھپا کر زلیخا کے لئے لاتے تھے۔ زلیخا کو اپنے گھر والوں سے کوئی اچھی چیز کھانے کو ملتی تو وہ اپنے یال خان کو کھلاتی تھی۔

اگرچہ گندی گلی سے اٹھنے والی آوازیں انہیں سنائی نہیں دیتی تھیں لیکن وہ اپنی اپنی عینک سے تاک جھانک کرنے والی عورتوں کو دیکھتے رہتے تھے۔ انہیں کسی کا ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ ڈرنے والا کام نہیں کرتے تھے۔ جیسے جیسے دن گزر رہے تھے' ان کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے۔ انہیں یقین ہوتا جا رہا تھا کہ دنیا والے مہربان ہیں۔ ان کے آخری دنوں کے آخری حقوق کو سمجھ رہے ہیں۔ ان کے آپس میں مل بیٹھنے پر اعتراض نہیں کریں گے۔ انہیں آخری سانس تک ایک دوسرے سے محبت اور توجہ ملتی رہے گی۔

پہلا اعتراض بڑی بہو نے کیا۔ اپنے میاں سے بولیں۔ "آپ کو پتا ہے۔ گندی گلی میں لیلیٰ مجنوں کا ڈراما ہو رہا ہے۔"

"ڈراما اور گندی گلی میں! کیا مذاق کر رہی ہو؟"

"مذاق تو ہماری عزت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ناک کٹنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی۔ آپ کے ابا جان ایک محترمہ سے عشق فرما رہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔"

"پہلے آپ گلی میں جائیں اور حساب کریں کہ کتنی عورتوں کی زبان کھینچ سکتے

ہیں۔ ہر زبان پر ان کی دیوانگی کا فسانہ ہے۔"

"دیکھو بیگم! میں اپنے باپ کی توہین برداشت نہیں کروں گا۔ اگر یہ جھوٹ ہوا تو........"

بیگم نے بات کاٹ کر کہا۔ "جو چور کی سزا' وہ میری سزا۔"

وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "سزا کی بات پر یاد آیا' آج صبح ایک غنڈہ موالی قسم کا آدمی میرا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا کہنے لگا۔ اے باؤ! تیرے بھائی کا نام خالد ہے نا؟ میں اس سے جیل میں مل کر آیا ہوں۔ میری سزا تو پوری ہو گئی۔ اس کی چند مہینے بعد ہو گی۔ میں نے کہا' میں نہیں جانتا تم کس خالد کی بات کر رہے ہو۔ اس نے کہا۔ میں تو تیرے پورے خاندان کو جانتا ہوں۔ تو اُدھر چار نمبر کی گلی میں رہتا ہے۔ بنک میں نوکری کرتا ہے۔ تیرا منجھلا بھائی پریس میں کام کرتا ہے۔ مگر چھوٹا بھائی مرد کا بچہ ہے۔ کیونکہ مرد کے بچے ہی جیل جاتے ہیں۔ میں اس غنڈے سے پیچھا چھڑا کر بنک میں پہنچا۔ وہاں اپنے دل کو سمجھاتا رہا۔ آج تک ہمارے خاندان میں کوئی تھانے نہیں گیا۔ خالد جیل کیسے جائے گا۔ یہ جھوٹ ہے۔"

بیگم نے کہا۔ "یہ سچ ہو سکتا ہے۔ خالد سے اور توقع کیا ہو سکتی ہے؟"

"اگر یہ سچ ہے تو کیا تھانے میں اور عدالت میں اس کے باپ کا نام اور گھر کا پتا نہیں پوچھا گیا ہو گا؟ اگر وہ کوئی واردات کرتا تو پولیس والے تحقیق و تفتیش کے لئے ضرور یہاں آتے۔"

"جب وہ موالی یہ گھر پہچانتا ہے' آپ تینوں بھائیوں کو جانتا ہے اور جب وہ جیل میں خالد سے مل چکا ہے تو اس کی باتیں غلط کیسے ہو سکتی ہیں؟ میری تو قسمت پھوٹ گئی ہے۔ ایسے خاندان میں بیاہ کر آئی ہوں' جہاں باپ قبر میں ایک پاؤں رکھ کر عشق کرتا ہے اور بیٹا جیل جا کر نام روشن کرتا ہے۔"

"تم ابا جان کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو؟"

"کل آپ کی چھٹی ہے۔ آپ گھر میں رہیں گے اور میں تماشا دکھاؤں گی۔"

دوسرے دن بیگم کو تماشا دکھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے گلی کے دروازے پر دستک دی۔ احمد یار خان باتھ روم سے نکل رہے تھے' انہوں نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ "فرمایئے؟"

اس نے کہا۔ "میرا نام راشد ہے۔ میں گلی کے اس مکان میں رہتا ہوں۔ آپ کے ہاں جو بزرگ ہیں، وہ آپ کے کون ہیں؟"

"میرے والد ہیں۔ میرا نام احمد یار خان ہے۔"

"احمد صاحب! مجھے آپ کے والد سے شکایت ہے۔ وہ میری بوڑھی والدہ کو بدنام کر رہے ہیں۔"

"کیا فرمایا آپ نے میرے والد آپ کی والدہ کو کیسے بدنام کر رہے ہیں؟"

"کمال ہے۔ پوری گلی میں چرچا ہو رہا ہے اور آپ کو خبر نہیں ہے۔ پہلے تو میں نے نرمی سے بزرگ کو سمجھایا۔ آپ ہمارے دروازے پر نہ آئیں تو وہ کچھ فلسفہ بولنے لگے۔ پھر میں نے سختی سے منع کیا تو وہ میری والدہ کو اپنے دروازے پر بلانے لگے ہیں۔"

"کیا آپ کی والدہ بلانے سے آجاتی ہیں؟"

"احمد صاحب! بڑھاپے میں انسان بچوں کی طرح کھانے کی چیزیں دیکھ کر للچاتا ہے وہ کبھی شامی کباب، کبھی آلو چاپ، کبھی ٹافیاں دکھاتے ہیں۔ میں اپنی والدہ کو ڈانٹتا ہوں۔ پھر بھی وہ چلی آتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجے گی۔ آپ بھی سختی کریں تو ہم جگ ہنسائی سے بچیں گے۔"

گرمی کا موسم تھا۔ صمد یار خان چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے بیٹے نے دروازے سے پلٹ کر گرجتے ہوئے پوچھا۔ "ابا جان! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ یہ کیسی ہنسی اڑانے والی شرم کی بات ہے۔ اس عمر میں آپ کو کیا سوجھ رہی ہے۔ میں تو زمین میں گڑا جا رہا ہوں، ایک شریف آدمی آپ کے خلاف شکایتیں لے کر ہمارے دروازے پر آیا ہے۔ بلکہ کہتے ہیں آپ کی بے حیائی کا چرچا پوری گلی میں ہے۔ یہ محلے والے ہمارے گھر کے متعلق کیا رائے قائم کر رہے ہوں گے۔ وہ یقیناً کہتے ہوں گے جس گھر کا بزرگ بے حیا ہے، اس گھر کے سبھی لوگ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوں گے۔ میں دنیا والوں کو کیا جواب دوں۔ میرے جوان بچے بھی بدنام ہو رہے ہوں گے............"

احمد یار خان بولتے بولتے ہانپنے لگے۔ بڑے میاں آرام سے بیٹھ کر انڈہ پراٹھا چبا رہے تھے۔ بیٹے کو ہوش آیا کہ وہ اب تک دیوار سے بول رہا تھا۔ اس نے غصے سے

پ کے سامنے رکھی ہوئی پلیٹیں اٹھا کر پھینک دیں۔ تب صمد یار خان نے چونک کر سر اٹھایا۔ بیٹے کو غصے میں بھرا ہوا دیکھا۔ پھر پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

ان کے لئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ اور غصہ دلانے والی بات تھی۔ وہ نصیحت کر رہے تھے۔ "بیٹا! اناج کو اس طرح نہیں پھینکنا چاہئے۔"

"اگر آپ ہمارے باپ نہ ہوتے تو ہم آپ کو اٹھا کر پھینک دیتے۔"

منجھلے بیٹے نے کان کے قریب آ کر کہا۔ "آپ کی بہو نے مجھے جو کچھ بتایا ہے، اسے سن کر ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ آپ صبح سے شام تک گلی میں کیا کرتے ہیں؟"

"وقت گزارتا ہوں۔"

"آج سے گلی کا دروازہ آپ کے لئے نہیں کھلے گا۔ آپ گھر سے باہر قدم نہیں رکھیں گے۔"

"کیا باہر گولیاں چل رہی ہیں؟"

"ہاں، چل رہی ہیں۔" بیٹے نے غصے سے کہا۔

وہ چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "پھر تو جانا ہوگا۔ زلیخا کی چوکھٹ میں دروازہ نہیں ہے۔ گولیاں ادھر آسکتی ہیں۔" دونوں بیٹوں نے انہیں زبردستی بٹھا دیا۔

دروازے پر کھڑے ہوئے راشد نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔

"اپنے باپ کو سمجھائیے۔ یہ میری والدہ کا نام لے رہے ہیں۔"

اسد یار خان نے پوچھا۔ "زلیخا آپ کی والدہ کا نام ہے؟"

"جی ہاں، میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔"

احمد یار خان نے کہا۔ "راشد صاحب! آپ برا نہ مانیں آپ کی والدہ ہماری بھی والدہ ہیں۔"

راشد نے کہا۔ "ہرگز نہیں، کیا آپ بھی اپنے باپ کا ساتھ دے رہے ہیں۔ میں اپنی ماں کو اس عمر میں کبھی آپ لوگوں کی ماں نہیں بننے دوں گا۔"

"ارے آپ تو کچھ اور سمجھ بیٹھے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کی والدہ کی عزت دنیا کی ہر ماں کی طرح کرتے ہیں۔ ہمارے والد کی طرف سے جو حماقتیں ہو رہی ہیں، اس پر ہم شرمندہ ہیں۔ آج سے ہم انہیں لگام دیتے ہیں۔ آپ بھی گلی کا دروازہ بند رکھیں۔"

"میرے گھر کا پچھلا دروازہ نہیں ہے۔ ہم نیچے کمرے کا دروازہ اور اوپر زینے کا دروازہ بند رکھتے ہیں۔ گھر میں والدہ اور میری بیوی سے بنتی نہیں ہے۔ روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر میں نے والدہ کو زینے کے نیچے رہنے کی جگہ دی ہے۔ میں ابھی چوکھٹ میں دروازہ نہیں لگا سکتا' میرا ہاتھ تنگ ہے۔ پلیز' آپ یہ دروازہ بند رکھیں۔ بڑے صاحب کو باہر نہ آنے دیں۔"

اسد یار خان نے باپ کے کان کے قریب چیخ کر کہا۔ "سنا آپ نے؟ آج سے گلی میں نہیں جائیں گے۔"

انہوں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ باہر گولیاں نہیں چل رہی ہیں۔ یہ دروازے پر زلیخا کا بیٹا کھڑا ہے۔ یہ میرا بھی بیٹا ہے۔ اسے اندر بلاؤ' چائے پلاؤ۔"

احمد یار نے پوچھا۔ "راشد صاحب نے آپ کو کچھ سمجھایا تھا؟"

"ہاں۔ میں نے بھی سمجھایا تھا مگر جوانی بڑھاپے کو سمجھنا نہیں چاہتی کیا اس نادان بیٹے کی شکایت پر مجھے گھر میں قید رکھو گے؟"

"جی ہاں۔ آپ صحن سے باہر نہیں جائیں گے۔"

"بیٹے! تم میرے باپ نہیں ہو اور نہ ہی کبھی اپنی اولاد کے بھی باپ کہلا سکو گے۔ کیونکہ باپ اسے کہتے ہیں جو پورے گھر کا مالک ہو کر بھی اولاد کی خوشی کے لئے اپنا بڑھاپا صحن میں گزارتا ہے۔ بہوؤں کی گستاخیاں اس لئے برداشت کرتا ہے کہ وہ بیٹوں کو راحت پہنچاتی ہیں۔ باپ رشتے سے زیادہ حوصلے کا نام ہے۔ تم لوگوں کے پاس رشتہ ہے' حوصلہ نہیں ہے۔ لہٰذا باپ بن کر حکم نہ دو۔ میں باہر ضرور جاؤں گا۔"

"کیا آپ تماشا بنانا چاہتے ہیں؟"

"ایک سیدھی سادی سچائی کو تم لوگ تماشا بنا رہے ہو۔ راشد کے گھر میں اوپر سے نیچے سات کمرے ہیں۔ ان میں سے ماں کے لئے ایک کمرہ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ بیوی نے اوپر کا حصہ میکے والوں کو دے رکھا ہے۔ نیچے خود رہتی ہے اور یہ میاں صاحب اپنی بیوی کو ناراض نہیں کر سکتے۔ اگر ماں اسے پیدا کر کے کہیں پھینک دیتی تو یہ گٹر کا کیڑا کہلاتا لیکن ماں پھر ماں ہے اسے جوان کرنے کے بعد خود گندی گلی میں بڑھاپا گزار رہی ہے۔ کیا اس گھر میں ماں اور اس گھر میں باپ تماشا نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو کس تماشے کی بات کر رہے ہو؟"

"ہم آپ سے بحث نہیں کر سکتے۔ آپ اتنا تو سمجھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں مرد اور عورت کو کھلے عام مل بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کھلے عام کا مطلب کیا ہے؟ راستے میں' پارک اور تفریح گاہوں میں' تقریبوں میں یا سفر کے دوران بیٹی اپنے باپ کے ساتھ' بہن اپنے بھائی کے ساتھ' ماں اپنے بیٹے کے ساتھ مل بیٹھتی ہے۔ اس کے ساتھ ہنستی بولتی ہے۔ اس میں برائی کیا ہے؟"

"راشد صاحب کی والدہ سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"گہرا رشتہ ہے' بہت گہرا رشتہ ہے۔ ہم دونوں ٹھکرائے ہوئے رشتے دار ہیں۔ ہم دو گھروں سے پھینکے ہوئے کچرے ہیں۔ گندی گلی میں ایک جگہ آپڑے ہیں۔ جب تک موت آکر ہم پر جھاڑو نہیں پھیرے گی ہم گلی میں پڑے رہیں گے۔ تم ہمیں اپنے بیڈ روم یا ڈرائنگ روم میں نہیں رکھو گے۔ ہم مانتے ہیں' بڑھاپا کھانستا ہے اور بلغم تھوکتا ہے مگر ہمارے لئے الگ کمرہ تو ہو سکتا ہے۔ راشد بیٹے! تم ماں کو ایک کمرہ کیا دو گے تمہاری بیوی تو اس کھلی چوکھٹ پر دروازہ بھی نہیں لگانے دے گی۔ دروازے کی رقم سے سونے کی بالیاں بنوالے گی۔ تمہارے سامنے پہن کر آئے گی اور تم یہ بھول جاؤ گے کہ ماں نے کھلی چوکھٹ کے سامنے کس طرح سردی کی ٹھٹھری ہوئی راتیں گزاری ہیں۔"

راشد نے کہا۔ "دیکھو بڑے میاں! میں بہت لحاظ کر رہا ہوں۔ میرے گھر کے معاملات میں مت بولو۔"

احمد اور اسد گلی میں آکر راشد سے باتیں کرنا چاہتے تھے۔ دروازے سے باہر آتے ہی پتا چلا' گلی میں درجنوں افراد ہیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ سبھی کو فرصت تھی۔ سبھی نے اپنی اپنی عورتوں سے صمد یار خان اور زلیخا کے متعلق سنا تھا۔ راشد کے پڑوسی نے پوچھا۔ "بھائی احمد صاحب یہ کیا چکر چل رہا ہے؟"

دوسرے صاحب نے کہا۔ "ہماری جوان نسل پہلے ہی بگڑی ہوئی ہے' اگر اتنی برس کی بوڑھی اور بوڑھے بھی لیلیٰ مجنوں بننے لگے تو ہماری نسل کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

راشد نے غصے سے کہا۔ "زبان کو لگام دو۔ ورنہ میں تمہارے بزرگوں کی شان میں گستاخی کروں گا۔"

"تم کیا گستاخی کرو گے؟ ہمارے بزرگوں میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔"

احمد نے کہا۔ "ہمارے بزرگوں نے کیا گناہ کیا ہے؟ کیا کسی نے آنکھوں سے کوئی قابلِ اعتراض بات دیکھی ہے؟"

پہلے تو سب کو چپ لگ گئی۔ پھر ایک نے کہا۔ "نہ دیکھنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ انہیں ڈھیل دی جائے۔"

اس نے کہا۔ "دیکھئے صاحبان! اگر آپ ہم پر کیچڑ اچھالیں گے تو آپ پر بھی چھینٹیں آئیں گے۔ ہمارے بزرگوں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے جس سے ہمیں شرمندگی ہو۔ اس کے باوجود ہم اپنے والد پر پابندیاں عائد کر رہے ہیں۔ راشد صاحب سے درخواست ہے کہ وہ اپنی چوکھٹ میں دروازہ لگا کر اسے بند رکھا کریں۔"

سب لوگ اس فیصلے سے متفق ہو گئے لیکن چھت پر کھڑے ہوئے نوجوان متفق نہیں تھے۔ فیصل اور جنید کے درجنوں دوست اپنے اپنے گھروں کی چھت سے گلی میں کھڑے ہوئے بزرگوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سال بھر سے زلیخا اور صدیار خان کو بھی دیکھتے آ رہے تھے اور ان کی معصوم محبت اور بے داغ ملاقاتوں کے چشم دید گواہ تھے۔

ایک نے پوچھا۔ "ہم اپنے والدین کو کیسے یقین دلائیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کا سہارا ہیں اور کچھ نہیں۔"

"والدین ہمیں نادان سمجھیں گے۔"

"ہمیں کھل کر کہنا ہو گا ہم پچھلے ایک برس سے آتے جاتے ان بوڑھوں کو دیکھتے رہے ہیں۔ ان کی ملاقات قابلِ اعتراض نہیں ہے۔"

"والدین ہمیں ڈانٹنا شروع کر دیں گے۔ ہم ان سے گستاخی نہیں کر سکتے اور ان بوڑھوں کے حقوق دلانا بھی ضروری ہے۔ ہمیں سر جوڑ کر کوئی ایسی تدبیر سوچنا چاہئے کہ انہیں حقوق بھی مل جائیں اور والدین ہم سے ناراض بھی نہ ہوں۔"

ایسی کوئی تدبیر سوچی جا سکتی تھی مگر بعض اوقات دماغ عین وقت پر کام نہیں کرتا۔ سوچتے سوچتے کئی دن گزر جاتے ہیں۔ راشد نے اسی دن مزدور لگا کر کھلی چوکھٹ میں دروازہ بنوایا۔ اسے لاک کر کے چابی اپنے پاس رکھ لی۔ احمد اور اسد نے صحن کے دروازے کو اندر سے مقفل کر دیا۔ کچرا وغیرہ پھینکنے کے لئے چابی اپنی بیگم کو دے دی۔ صدیار خاں تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہتے رہے۔ "ارے کمبختو! تمہارے دماغوں میں گندگی بھری ہے۔ تمہارے اندر کا شیطان کہتا ہے کہ میں گناہ گار ہوں۔

اپنے اندر کے انسان سے پوچھو' وہ تمہیں یاد دلائے گا کہ میں تمہارا باپ ہوں۔ میں نے جوانی میں ٹھوکر نہیں کھائی تو بڑھاپے میں کیسے کھاؤں گا۔"

وہ تمام دن بڑبڑاتے رہے۔ رات کو بھی جب تک جاگتے رہے' کچھ نہ کچھ بولتے رہے۔ دوسری صبح انہوں نے ناشتے سے انکار کیا۔ سائرہ اور فائزہ نے انہیں سمجھا منا کر کھلایا۔ وہ کھانے کے بعد دروازے کے پاس فرش پر بیٹھ گئے۔ کہنے لگے۔ "دروازہ کھولو۔"

بڑی بہو نے کہا۔ "میں نہیں کھولوں گی۔"

انہوں نے کہا۔ "دلہن! میں نے کبھی کسی بات پر تم سے جھگڑا نہیں کیا۔ تم نے آج تک جیسا بھی سلوک کیا۔ میں نے چپ چاپ برداشت کر لیا' مگر آج برداشت نہیں کروں گا۔"

"برداشت نہیں کریں گے تو پھر کیا کریں گے۔ مجھے ماریں گے؟ گالیاں دیں گے۔ یا دروازہ توڑ کر نکل جائیں گے۔"

"میں بھوکا رہوں گا نہ کھاؤں گا نہ ایک گھونٹ پانی پیئوں گا' جب تک دروازہ نہیں کھلے گا' میں یہیں بیٹھا رہوں گا۔"

"آپ کو شرم آنا چاہئے۔ جوان پوتوں کے سامنے ایسی حرکتیں کر رہے ہیں۔ بڑھاپے میں یہی ایک کام رہ گیا تھا۔ اب مجنوں کی طرح لیلیٰ لیلیٰ پکارنا شروع کر دیجئے۔"

"ہم نے کچھ نہیں کیا اور بدنام ہو رہے ہیں۔ زلیخا کو آواز دوں گا تو وہ اونچا سنتی ہے' اس کی جگہ محلے والے سن لیں گے' اسے اور زیادہ بدنام کریں گے۔"

وہ دروازہ دوپہر تک بند رہا۔ گھر میں صبح سے کچرا جمع ہو رہا تھا۔ آلو اور آم کے چھلکوں اور مچھلی کی بساند گھر میں پھیل رہی تھی۔ فائزہ نے کہا۔ "امی! اسے باہر پھینکیں' سانس لینا دوبھر ہو رہا ہے۔"

"اسے' کیسے پھینکوں؟ دروازے پر تو تمہارے دادا جمے بیٹھے ہیں۔ وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔"

ثمینہ نے صدیار خان کے پاس آ کر کہا۔ "آیئے کھانا کھا لیجئے۔"

"میں نہیں کھاؤں گا۔"

"آپ کمزور ہیں۔ بھوک برداشت نہیں کر سکیں گے۔"

"کوئی بات نہیں' مرجاؤں گا۔"

چھوٹی بہو نے کہا۔ "اب تو یہ بُو برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ آپ دروازہ کھول دیں۔ بڑے میاں جاتے ہیں تو جائیں۔ ہم انہیں باندھ کر نہیں رکھ سکتے۔"

بڑی بہو نے کچرا پھینکنے کے لئے دروازہ کھولا۔ صمد یار خان باہر آ گئے۔ چبوترے پر بیٹھ کر عینک لگائی۔ وہ کھلی ہوئی چوکھٹ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہاں دروازہ لگ گیا تھا اور وہ بند کر دیا گیا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ چھڑی ٹیکتے ہوئے بند دروازے کی طرف جانے لگے۔ بہو کچرا پھینکنے کے بعد انہیں دیکھ رہی تھی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "ایسی جوانی تو جوانوں پر بھی نہیں آتی ہو گی۔ یہ بڑے میاں ضرور جوتے کھائیں گے۔ ہمارا کیا ہے' ان کے بیٹے کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

وہ زلیخا کے دروازے پر پہنچ کر فوراً ہی آواز نہ دے سکے۔ تھوڑی دیر تک ہانپتے رہے۔ دروازے کو دوبار چھڑی سے مارا۔ اندر سے زلیخا کی آواز سنائی دی۔ اسے بھی الفاظ سمجھ میں نہیں آئے۔ اس نے کہا۔ "دلوازے پر تالا لگا ہوا ہے۔ تالا۔ تالا۔"

بار بار کہنے سے سمجھ میں آیا۔ وہ بے بسی سے دروازے کو دیکھنے لگے۔ پھر بولے۔ "تم نے کچھ کھایا ہے؟"

وہ بولی۔ "بہت گرمی لگ لہی ہے۔ ایک پنکھا بھی نہیں ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "اچھی بات ہے۔ کچھ نہ کچھ کھا لیا کرو۔ میری فکر نہ کرو۔ میں ابھی جا کر کھا لوں گا۔"

"میں نے بیٹے سے کہا کہ ایک پنکھا لگا دو۔ اس نے ایک گتہ لا کے دیا ہے۔ میں اسے پنکھا سمجھ کر جھلتی ہوں۔ پھر بھی گرمی لگتی ہے۔"

"اللہ نے چاہا تو سب رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ میں نے زبردستی دروازہ کھلوایا ہے۔ تمہارا دروازہ بھی کھل جائے گا۔"

وہ اپنی کہہ رہی تھی' یہ اپنی کہے جا رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ میں نہیں سن رہی ہوں مگر وہ تو سن رہے ہیں۔ اسی لئے تو جواب دے رہے ہیں۔ کاش' ان کا تھوڑا سا جواب سمجھ میں آ جاتا۔

صمد یار خان کا بھی یہی خیال تھا' مجھے اس کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں مگر وہ سمجھ کر جواب دے رہی ہے اور میں اندازے سے اس کے جواب کا جواب دے رہا ہوں۔ بات کسی طرح بن رہی ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ اس کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

وہ دونوں مطمئن تھے۔ کچھ نہ کچھ بولتے جا رہے تھے اور ایک دوسرے کی آواز سنتے جا رہے تھے۔ پھر وہ اپنے دروازے پر آئے۔ چبوترے پر بیٹھ کر بولے۔ "بیٹی ثمینہ! آج کیا پکایا ہے؟"

بہو نے پوچھا۔ "کیا گلی میں بیٹھ کر کھانے کا ارادہ ہے؟ توبہ ہے۔ میں خوامخواہ پوچھ رہی ہوں' وہ تو قیامت تک بہرے رہیں گے۔ جاؤ ثمینہ' کھانا وہیں پہنچا دو۔ وہ زمانے بھر کے ڈھیٹ ہیں۔ اندر نہیں آئیں گے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ اندر آتے ہی میں دروازہ بند کر دوں گی۔"

ثمینہ ایک ٹرے میں شامی کباب اور روٹیاں لے کر آئی۔ قریب ہو کر بولی۔ "گندی گلی میں بیٹھ کر کھانا اچھی بات نہیں ہے۔ اندر آ جایئے۔"

انہوں نے ایک پلیٹ میں رکھے ہوئے شامی کبابوں کو دیکھا۔ اس میں سے دو کباب اٹھائے۔ پھر اٹھ کر بولے۔ "ابھی آتا ہوں۔"

ثمینہ گم صم ہو کر دیکھتی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے خالد ہاتھ میں شامی کباب لئے ثمینہ سے پوچھنے جا رہا تھا۔ "کیا تم بھوکی ہو؟ یہ لو میں اپنے حصے کا کھانا لایا ہوں۔"

صمد یار خان دروازے کے پاس پہنچ کر کہہ رہے تھے۔ "زلیخا! دروازے کے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں نیچے سے شامی کباب بڑھا رہا ہوں۔"

دروازے اور چوکھٹ کے نچلے حصے کے درمیان اتنا خلا تھا کہ وہاں سے بہ آسانی ایک پلیٹ اندر پہنچائی جا سکتی تھی۔ انہوں نے زمین پر ایک رومال بچھایا' اس پر شامی کباب رکھے۔ پھر تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے اسے سرکاتے ہوئے دروازے کے نیچے سے گزارنے لگے۔

دوسری طرف زلیخا دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے یار خان کی صرف آواز سنی تھی' الفاظ سمجھ میں نہیں آئے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاؤں کے پاس کھانے کی چیز آ رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔ "تم چپ کیوں ہو گئے؟ بولتے

کیوں نہیں؟"

وہ کھڑے ہو کر بولے۔ "بیٹھ جاؤ۔ نیچے دیکھو میں تمہارے لئے کچھ لایا ہوں۔"

وہ بولی۔ "تم چپ ہو گئے تھے۔ میں سمجھی چلے گئے ہو۔"

گندی گلی میں اور وہاں کے گھروں میں چوہے بہت تھے۔ ایک موٹے تازے چوہے نے پہلے شامی کباب کو دیکھا۔ پھر منہ میں دبا کر لے گیا۔ صمد یار خان نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے' تم ابھی تک کھڑی ہوئی ہو۔ بیٹھ جاؤ' بیٹھ جاؤ' نیچے دیکھو؟"

آخری لفظ اس کے پلے پڑا۔ وہ بولی۔ "کیسے دیکھوں۔ دلوازہ بند ہے۔ تم کیسے دکھائی دو گے؟"

اس کی آواز سے پتہ چل رہا تھا۔ وہ ہنوز کھڑی ہوئی ہے۔ صمد یار خان نے کچھ دیر سوچا پھر نیچے بیٹھ کر اپنی چھڑی دروازے کے نیچے سے گزاری۔ چھڑی اس کے پاؤں سے لگی۔ اس نے چونک کر نیچے دیکھا۔ پھر بیٹھ گئی۔ خالی رومال کو اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "ہاں' مل گیا۔ تمہارا رومال مل گیا۔"

وہ نیچے سے چھڑی نکالنا چاہتے تھے' ایک شخص نے اسے پاؤں تلے دباتے ہوئے پوچھا۔ "بڑے میاں! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ محلے کے چار آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور دور تک عورتیں اپنے دروازوں پر کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ دروازے کا سہارا لے کر اٹھنے لگے۔ ایک شخص نے نیچے سے چھڑی نکالتے ہوئے کہا۔ "کیا ڈھٹائی ہے۔ آج کل کے جوان بھی دن دھاڑے ایسا عشق نہیں کرتے ہوں گے۔"

دوسرے شخص نے کہا۔ "ان کے صاحبزادے نے کہا تھا کہ میرے والد صاحب نے کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی ہے۔ کوئی چشم دید گواہ نہیں ہے۔ آج تو ہم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔"

ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے کہا۔ "بڑے میاں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ چلتے ہیں تو بید کی طرح کانپتے ہیں۔ مگر نیت دیکھو تو شیطان کی ہے۔ ہم عورتوں کو آئندہ بڑے بزرگوں سے بھی پردہ کرنا چاہئے۔"

"ہماری سمجھ میں نہیں آتا' اس بزرگ کا کیا کریں۔ اس پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے

بھی شرم آتی ہے۔ وہ خاتون ٹھیک کہتی ہیں۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر شریف زادیوں کا اعتماد اپنے بزرگوں پر سے اٹھ جائے گا۔"

ایک شخص نے ان کے ہاتھ میں چھڑی پکڑا کر کہا۔ "جاؤ بزرگو! گھر جا کر آرام سے بیٹھو۔ تمہارا فیصلہ پنچایت میں ہو گا۔"

وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے اپنے دروازے کی طرف جانے لگے۔ آج انہیں چھڑی کی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ آج دنیا والے بوڑھے قدموں کے نیچے سے زمین سرکا رہے تھے۔

☆------☆------☆

اس نے سر سے پاؤں تک خالد کو دیکھا پھر نسوار کی ڈبیا میں لگے ہوئے آئینے میں خود کو دیکھا جیسے اپنا اور خالد کا موازنہ کر رہا ہو۔ ایک جوان نے کہا۔ "سردار خان! یہ میرا بچپن کا دوست خالد ہے۔ ہماری لائن کا آدمی نہیں ہے مگر میں اس کو لائن بتا دوں گا۔ یہ پڑھا لکھا آدمی ہے' دو چار دن میں چالو ہو جائے گا۔"

سردار خان نے نسوار کی ڈبیا کھولی۔ اس میں انگلی ڈال کر نسوار نکالی' منہ کھول کر اسے داڑھ میں دبایا۔ اس عمل کے دوران وہ خالد کو دیکھ رہا تھا اور خالد نظریں چرا رہا تھا۔ آس پاس کئی لوگ مختلف چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار خان تنہا ایک چارپائی پر تھا۔ اس نے ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "بشیرے! تیرا دوست عورتوں کی طرح نظریں چراتا ہے۔ یہ مرد ہے بھی یا نہیں؟"

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ بشیرے نے کہا۔ "یہ بہت ہی شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے ہاں دستور ہے' یہ بڑوں سے نظریں ملا کر بات نہیں کرتے۔"

سردار خان نے پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ڈبیا کے آئینے میں پھر اپنا اور اس کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد کہا۔ "کبھی میں بھی شریف تھا۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن اس دھندے کا بادشاہ بن جاؤں گا۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ شریف آدمی بدمعاشوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ جب شرافت کو پیچھے چھوڑ کر ایسے دھندوں میں آتا ہے تو بڑے بڑے بدمعاشوں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔"

بشیر نے خوش ہو کر پوچھا۔ "اس کا مطلب ہے' اسے چانس ملے گا۔"

اس نے کہا۔ "لیکن ہر شریف آدمی اپنا چولا اتار کر سردار خان نہیں بن سکتا۔ بلکہ اپنے اناڑی پن کے باعث خود بھی پھنستا ہے۔ ہمیں بھی پھنسا دیتا ہے۔"

ایک نے مشورہ دیا۔ "اس نوجوان کو اڈے سے دور رکھ کر آزمانا چاہئے۔"

سردار خان نے کہا۔ "ہاں' ہمارا یہ اڈا اہم نہیں ہے۔ سسرال سے بارات آنے

الی ہے بشیرے! تم اس کے ساتھ یہاں رہو اور بارات کا استقبال کرو۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اس کے حواری بھی کھڑے ہو گئے پھر وہ سب پچھلے روازے سے باہر چلے گئے۔ دوسرے کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے نشہ کر رہے تھے۔ شیرے نے خالد کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "تمہارا کام بن گیا۔ سردار تمہیں کام ے رہا ہے۔"

خالد نے کہا۔ "لیکن اس نے تو کسی بارات کا استقبال کرنے کا حکم دیا ہے۔"

"ہاں سسرالی بارات یعنی یہاں پولیس چھاپا مارنے والی ہے۔"

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہاں پولیس آئے گی؟"

"ہاں' ہمیں پکڑ کر لے جائے گی۔ ہم یہاں سے حوالات پھر حوالات سے جیل ائیں گے۔"

"مگر کیوں؟ وہ سردار خان اپنے حواریوں کے ساتھ چلا گیا۔ وہ ہمیں قربانی کا بکرا نانا چاہتا ہے' مگر ہم کیوں بنیں؟"

"نہ بنو' چلے جاؤ' کہیں ہزار بارہ سو کی نوکری ملتی ہو تو کرلو۔ ورنہ گھر جا کر ائیوں سے معافی مانگ لو۔ ثمینہ سے شادی کا خواب نہ دیکھو۔"

"نہیں میں پوری مستقل مزاجی سے آیا ہوں' ناکام واپس نہیں جاؤں گا لیکن میں یل جاؤں گا تو میرے خاندان کی بدنامی ہوگی۔"

"تھانے میں فرضی نام اور پتا بتا دینا۔ یا کہہ دینا تمہارا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔"

"کیا پولیس والے مان لیں گے؟ وہ انکوائری کریں گے۔"

"سردار خان انکوائری نہیں کرنے دے گا۔ یہ سب ملی بھگت ہے۔ پہلے سے خبر ی گئی ہے کہ یہاں چھاپا پڑے گا۔ پولیس کی کارکردگی دکھانے کے لئے دوسرے کمرے میں کچھ نشہ کرنے والوں کو بٹھایا گیا ہے۔ ہم دونوں اڈا چلانے والوں کی حیثیت سے موجود ہیں اور جس چارپائی پر سردار خان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے نیچے آدھا کلو یروئن رکھی ہوئی ہے۔"

"صرف آدھا کلو؟"

"یہ بھی بہت ہے۔ جب سہراب گوٹھ جیسے مرکز سے پانچ کلو برآمد نہیں ہو سکتی تو

ان چھوٹے اڈوں سے اور کتنے مال کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

"مگر ہمیں جیل جا کر کیا ملے گا؟"

"جیل کی بھی ایک وسیع دنیا ہے۔ اس دنیا میں بھی انسان رہتے ہیں۔ بلکہ دکھی انسان رہتے ہیں' وہ اپنا دکھ بھولنا چاہتے ہیں۔ وہ محبت کرنے والی بیویوں اور معصوم بچوں کے لئے تڑپتے ہیں۔ یہ دکھ' یہ تڑپ' یہ بے چینی نشے سے دور ہوتی ہے۔ ہمارا دھندا وہاں بھی چلتا ہے تم وہاں جتنی پڑیاں فروخت کر سکو گے' اتنا ہی تمہارا کمیشن بنے گا۔ پھر سردار خان کی طرف سے جیل جانے کا معاوضہ ماہانہ ایک ہزار روپے ہے۔ اگر دس ماہ سزا کاٹ کر آؤ گے تو یکمشت دس ہزار روپے مل جائیں گے۔ یا اپنے گھر کا پتا بتاؤ گے تو ہر ماہ وہاں رقم پہنچ جایا کرے گی۔"

یہ خالد کا پہلا تجربہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بہ آسانی اس مرحلے سے گزر جائے گا۔ پولیس آئے گی اور عزت سے پکڑ کے لے جائے گی لیکن ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے اسے حقیقی انداز میں چلے کرنا پڑتا ہے۔ سپاہیوں نے چاروں طرف سے اڈے کو گھیر لیا۔ وارننگ دی کہ سب لوگ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائیں۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ دو سپاہیوں نے اندر جا کر تصدیق کی کہ وہاں اور کوئی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی خطرناک اسلحہ ہے۔ چارپائی کے نیچے سے آدھا کلو ہیروئن بھی برآمد کر لی گئی۔ تب ایک انسپکٹر نے خالد کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔ "کتے کی اولاد' تیرا باپ سردار خان کہاں ہے؟"

خالد کا خون کھول رہا تھا۔ دماغ گرم ہو رہا تھا۔ آج تک اس نے کسی سے ماں باپ کی گالی نہیں سنی تھی۔ اڈے کے باہر سڑک پر لوگوں کی بھیڑ لگ رہی تھی سپاہی رائفلیں تانے ہوئے لوگوں کو دور بھگا رہے تھے۔ اس کے باوجود ایک خلقت تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایسی بے عزتی کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ انسپکٹر نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔ "سالا گونگا ہے۔ پولیس کا ڈنڈا پیدائشی گونگوں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"

بشیرے کے ساتھ بھی یہی سلوک ہو رہا تھا۔ دونوں کو ہتھکڑیاں پہنا دی گئی تھیں۔ انہیں کبھی ہاتھوں سے اور کبھی لاتوں سے مارا جا رہا تھا۔ پبلک کو یہ دکھایا جا رہا تھا کہ قانون نافذ کرنے والے کتنے سخت ہیں۔ منشیات کی لعنت سے قوم کو نجات دلانے کے

لئے منشیات فروشوں سے جانوروں جیسا سلوک کرتے ہیں۔

توہین کے شدید احساس سے خالد پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد نہیں تھا کہ وہ کس طرح اڈے سے تھانے پہنچا۔ حوالات میں پہنچ کر وہ اپنا سر دیوار سے ٹکرانے لگا۔ "بشیرے تُو نے مجھے کہاں لا کر پھنسا دیا۔ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ سرعام ایسی بے عزتی ہوتی ہے جسے کوئی شریف آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔"

بشیرا اسے دیوار کے پاس سے کھینچ کر بولا۔ "تم نادان بچے نہیں ہو۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ پولیس والے جوتوں سے باتیں کرتے ہیں۔ گالیاں دے دے کر سوال کرتے ہیں۔ جواب نہ ملنے پر ڈنڈے جماتے ہیں۔"

"کیا اب ڈنڈوں سے مار پڑے گی؟"

"نہیں۔ اب ہم اندر آ گئے ہیں۔ باہر جو کچھ ہوا وہ دنیا والوں کو دکھانے کے لئے تھا بس دعا کرو' کوئی بڑا افسر نہ آ جائے۔"

"اس کے آنے سے کیا ہوگا؟"

"اپنے اعلیٰ افسر کو دکھانے کے لئے پوچھ گچھ کی جائے گی اور ڈنڈے جمائے جائیں گے۔"

"نہیں' میں یہ برداشت نہیں کروں گا' صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں کام تلاش کرنے آیا تھا' مفت میں پکڑا گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار سردار خان کو دیکھا تھا۔ اس سے پہلے میں نے اس کا نام تک نہیں سنا تھا۔"

"سردار خان یہی چاہتا ہے کہ تم یہی بیان دو۔ میں بھی یہی کہوں گا کہ ہم دونوں کام کی تلاش میں آئے تھے۔"

"مگر تم تو بدنام ہو کئی بار جیل جا چکے ہو۔ کیا یہ تھانیدار تمہیں نہیں پہچانتا ہے؟"

"بشیرے کے نام سے پہچانتا ہے۔ اس بار میرا نام گلزار خان ہے۔"

"ارے نام بدلنے سے کیا ہوتا ہے۔ چہرہ تو وہی ہے۔"

"چہرہ وہی ہے مگر کسی تھانے میں میری تصویر نہیں ہوتی۔ تمہاری تصویر بھی نہیں ہوگی۔"

تھوڑی دیر بعد انہیں حوالات سے نکالا گیا۔ ایک فوٹو گرافر اور چند پریس رپورٹر آئے تھے۔ اڈے سے جتنے لوگ پکڑے گئے تھے' انہیں دوبارہ ہتھکڑیاں پہنا کر فرش پر

اکڑوں بٹھایا گیا۔ انسپکٹر ہتھکڑیوں کی زنجیریں تھام کر ان کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ تمام سپاہی بھی اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ بشیرے اور خالد نے اپنے چہرے کو چادروں سے چھپا لیا۔ انسپکٹر نے اعتراض نہیں کیا۔ ایک رپورٹر نے کہا۔ "جب چہرے ہی چھپ جائیں گے تو تصویر اتارنے کا مقصد کیا رہ جائے گا؟"

سردار خان کی طرف سے اس کے آدمیوں کے چہرے چھپانے کی بھاری قیمت ادا کی جاتی تھی۔ انسپکٹر نے رپورٹر سے کہا۔ "آپ نے بڑا اہم سوال کیا ہے۔ دراصل تھانے میں لائے جانے والے لوگ ملزم ہوتے ہیں۔ جب تک جرم ثابت نہ ہو جائے' وہ مجرم نہیں ہوتے۔ کسی ملزم کی تصویر اخباروں میں شائع کر کے اسے بدنام کرنا مناسب نہیں ہے۔ وہ عدالت میں بے قصور ثابت ہو سکتا ہے۔"

دوسرے رپورٹر نے کہا۔ "لیکن آپ نے انہیں مال کے ساتھ پکڑا ہے۔"

"ہم نے نشہ کرنے والوں کو پکڑا ہے لیکن یہ دو ملزم خالد اور گلزار خان بھی تھانے نہیں آئے۔ ہو سکتا ہے' یہ اپنے نشہ کرنے والے عزیزوں کو ڈھونڈنے وہاں پہنچے ہوں اور ہمارے ہاتھ لگ گئے ہوں۔"

انسپکٹر نے رپورٹروں کو قائل کر دیا۔ خالد اور بشیرے کی تصویر نقاب کے ساتھ اتاری گئی' دوسرے دن اخبار میں بھی شائع ہو گئی۔ خالد بڑے انوکھے تجربات سے گزر رہا تھا۔ عدالت میں اسے چھ ماہ کی سزا سنائی گئی۔ جیل میں پہنچ کر ایک بہت ہی تلخ تجربہ ہوا' وہاں قیدیوں سے ہر طرح کا کام لیا جاتا تھا۔ انکار کرنے والوں کو ایسی اذیت ناک سزائیں دی جاتی تھیں کہ وہ توبہ کرنے لگتے تھے۔ بے چوں و چرا اس اپنے مزاج کے خلاف کوئی سا بھی کام کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ خالد کو چند قیدیوں کے ساتھ سنڈاس کی صفائی کا کام دیا گیا۔ وہ ایک دم سے تلملا کر بولا۔ "جیلر صاحب! میں تعلیم یافتہ ہوں۔ ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ اللہ کے لئے مجھے بھنگیوں کا کام نہ دیں۔"

جیلر نے پوچھا۔ "کیا تم تعلیم یافتہ ہو؟"

"جی ہاں۔"

"کیا نماز پڑھتے ہو۔"

"کبھی کبھی پڑھتا ہوں۔"

"عشا کی نماز میں کتنی رکعتیں ہوتی ہیں؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا' پتا نہیں کتنے برس ہو گزرے تھے۔ اس نے صرف عید کی نمازیں پڑھی تھیں۔ جیلر نے کہا۔ "ہم صرف نمازیوں سے اور کلام پاک کی تلاوت کرنے والے قیدیوں سے بھنگیوں کا کام نہیں لیتے۔ باقی جیل کے تمام قیدی باری باری یہ کام کرتے ہیں۔ تم بھی یہی کرو گے۔"

وہ گڑگڑانے لگا۔ اپنی شرافت اور اعلیٰ خاندان کا حوالہ دینے لگا۔ اسے ایک ہی جواب ملا۔ جیل میں تمام قیدی ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں' اسے مجرموں کا خاندان کہتے ہیں۔ دوسرے دن وہ چند قیدیوں کے ساتھ سنڈاس کی صفائی کے لئے پہنچا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ناک اور منہ پر کپڑا باندھ لیا تھا۔ اس کے باوجود قے ہو گئی لیکن اسے کام کرنا پڑا کیونکہ ڈنڈے پڑ رہے تھے۔

اس کام سے فارغ ہو کر جب اسے دوپہر کی روٹی ملی تو وہ کھا نہ سکا۔ اسے ابھی تک گھن آ رہی تھی۔ ظہر کے وقت کتنے ہی قیدی وہاں کی مسجد میں نماز پڑھنے جا رہے تھے' ان میں بشیر بھی تھا۔ خالد غصے سے تلملا کر رہ گیا۔ سپاہیوں کی موجودگی میں اسے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ رات کو سلاخوں کے پیچھے بند ہونے کے بعد اس نے بشیر کا گریبان پکڑ کر کہا۔ "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تم نے مجھے بھنگی بنا دیا ہے۔"

بشیرے نے ایک جھٹکے سے گریبان چھڑا کر کہا۔ "تم خاک تعلیم یافتہ ہو؟ خواہ مخواہ ڈینگیں مارتے ہو مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہیں نماز بھی نہیں آتی۔ معلوم ہوتا تو میں تمہیں پہلے ہی سمجھا دیتا۔ اچھا یہ بتاؤ' اپنی مذہبی کتاب تو پڑھنا جانتے ہو؟"

"ہاں' جانتا ہوں۔"

"بس تو پھر آرام سے سو جاؤ۔ کل سے تم صبح و شام تلاوت میں مصروف رہو گے۔ باقی جو وقت بچے گا اس میں ہم پڑیاں سپلائی کریں گے۔"

"کیا بکتے ہو؟ میں ہاتھ میں کلام پاک اٹھانے کے بعد ایسا کوئی دھندا نہیں کروں گا؟"

"سوچ لو' بھنگی کے کام سے اسی طرح بچ سکتے ہو۔"

خالد کا سر چکرا رہا تھا۔ بے شک' اللہ نظر نہیں آتا مگر اس کا خوف تو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ اور آخری رسولؐ سے بے پناہ عقیدت ہوتی ہے اور اس آسانی

آخری کتاب کا احترام ہوتا ہے۔ خالد نے وضو کئے بغیر کبھی کلام پاک کو ہاتھ نہیں لگایا
تھا۔ تلاوت کے دوران اگر اس سے کوئی بات پوچھی جاتی تو وہ صحیح جواب دیتا تھا۔
کلام پاک کے سامنے جھوٹ بولتے وقت آپ ہی آپ شرم آتی تھی۔ بے اختیار زبان
سچ بولتی تھی۔ جوانی میں اس نے کلام پاک کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن بچپن کی تعلیمات کا
اثر تھا۔ اس کا دل' اس کا ضمیر گوارا نہیں کرتا تھا کہ مقدس کتاب کی آڑ لے کر جرم
کرتا رہے۔

اس رات وہ کشمکش میں مبتلا رہا۔ اسے اپنی گندی گلی کا وہ خاکروب یاد آرہا تھا
جس نے اپنی شادو کو حاصل کرنے کے لئے ہاتھ میں جھاڑو پکڑلی تھی۔ خالد نے اس کے
ہاتھ سے سگریٹ پینا گوارا نہیں کیا تھا اور آج وہ اس سے بھی زیادہ غلیظ کام کرچکا تھا
اور مزید چھ دن اسے یہ کام کرنا تھا۔ اس کے بعد ڈیوٹی بدلنے والی تھی۔

اگر پڑیاں فروخت کرنے سے انکار کرتا تو اس دھندے سے نکل جاتا۔ جیل میں
اس کا کمیشن نہ بنتا۔ رہائی پانے کے بعد سردار خان اسے چھ ہزار روپے نہ دیتا۔ بشیر
نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس دھندے سے توبہ کرنے والا سکون سے نہیں رہتا۔
سردار پھر اسے کسی چکر میں ڈال کر گرفتار کرادیتا ہے۔ نام پولیس والوں کا ہوتا ہے کہ
انہوں نے سردار خان کے آدمیوں کو پکڑا ہے۔

پہلے ہی اس کی دنیا تاریک تھی۔ جیل سے نکلنے کے بعد اور بھی تاریک ہونے
والی تھی۔ پہلے کون سا شریفانہ روزگار مل رہا تھا۔ مجرم بننے کے بعد اس کی توقع فضول
تھی۔ آمدنی کا ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس پر وہ فخر کرتا۔ بڑی شان سے گھر واپس جاتا
اور اس کی شان وشوکت دیکھ کر بھائی جان خود ہی ثمینہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے
دیتیں۔ مستقبل میں دور دور تک اس کے خوابوں کی تعبیر نہیں تھی۔ بس یہی ایک
راستہ تھا بشیر نے سمجھایا تھا۔ غلط دھندے میں کبھی کبھی ایسا داؤ لگ جاتا ہے کہ ایک ہی
دن میں لاکھوں کی کمائی ہوجاتی ہے۔

اس نے غلاظت قبول کرلی۔ اس نے مزید چھ دنوں تک بھنگی کا کام کیا۔ دوسری
بار اس کی باری پانچ ماہ بعد آئی یعنی چھ ماہ میں اس نے دو ہفتے یہ ذہنی اذیت برداشت
کی لیکن اس دوران پڑیا کے کئی گاہک بنالئے۔ ایک علاقے کا دادا وہاں سزا کاٹ رہا
تھا۔ وہ خالد کا دوست بن گیا۔ جب وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے رات گزارنے آتے تو وہ

کہتا۔ "خالد بھائی! کوئی علم کی بات کرو۔"

خالد اسے بڑے بڑے ادیبوں کو متاثر کرنے والے فقرے اور نامور شاعروں
کے عمدہ اشعار سناتا تھا۔ گلو دادا سن سن کر جھومتا تھا اور کہتا تھا۔ "واہ علم بھی کیا چیز
ہے' نصیب والوں کو ملتا ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہے' ایک علم نہیں ہے۔"

"گلو دادا' یہ علم ذہن کو روشنی دیتا ہے۔ زندگی کو کچھ نہیں دیتا' اگر دیتا تو میں
یہاں نہ ہوتا۔"

"فکر نہ کرو دوست! میری سزا پوری ہو رہی ہے۔ میں اگلے ہفتے یہاں سے چلا
جاؤں گا۔ تم اپنی سزا پوری کرکے میرے پاس آجانا تم اپنا دھندا میرے علاقے میں کرو
گے۔ میں کسی اور کو پڑیا بیچنے کی اجازت نہیں دوں گا۔"

چھ ماہ بعد خالد جیل سے باہر آیا۔ اس رات بشیر کے ساتھ ایک اڈے میں جاکر
سردار خان سے ملاقات کی۔ سردار خان نے خوش ہوکر خالد سے کہا۔ "تم نے تو کمال
کردیا۔ جیل میں آج تک کسی نے اتنی پڑیاں فروخت نہیں کیں۔ جتنی تم نے کرڈالیں
اور میں اس کی وجہ جانتا ہوں۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑ کر قہقہہ لگایا۔ پھر کہا۔ "جیل میں گلو دادا تم پر مہربان
تھا۔ قیدی اس کے ڈر سے پڑیاں خرید لیا کرتے تھے۔ تمہارے کمیشن کی رقم پانچ ہزار
روپے ہوگئی ہے۔ چھ ماہ جیل میں رہنے کے چھ ہزار روپے ملا کر کل رقم گیارہ ہزار
روپے بنتی ہے۔ کل صبح آکر اپنی رقم لے جاسکتے ہو۔"

خالد نے کہا۔ "سردار' ایک مہربانی چاہتا ہوں۔"

"بولو' میں تم سے خوش ہوں۔ تم کام کے آدمی ہو۔"

"میں گیارہ ہزار روپے نہیں چاہتا۔ اس کے بدلے مجھے مال دے دو۔"

"کیا اتنا مال کھپا سکو گے؟"

"جی ہاں' گلو دادا کے پورے علاقے میں صرف میں مال بیچوں گا۔"

"اچھی طرح سوچ لو۔ جو لوگ وہاں مال بیچتے آرہے ہیں' ان سے خون خرابا
ہوسکتا ہے۔"

"ہونے دو' جب میں نے گالیاں سن لیں۔ لات جوتے کھالئے عزت کی پروا
نہیں کی تو جان کی پرواہ کیا کروں گا۔"

دوسرے دن وہ مال لے کر گلو دادا کے پاس پہنچا۔ دادا نے اسے گلے لگا لیا۔ پھر کہا۔ "سب سے پہلے تمہیں اس علاقے کے دوسرے دادا سے ملاؤں گا۔"

خالد نے پوچھا۔ "کیا یہاں دو دادا ہیں؟"

"میرے دوست! ہر علاقے میں دو دادا ہوتے ہیں۔ دوسرے دادا کو خوش رکھے بغیر کوئی غلط دھندا ہو ہی نہیں سکتا۔"

اس نے خالد کو ایک ہزار روپے دیئے' اسے ساری باتیں اچھی طرح سمجھا دیں پھر اسے علاقے کے تھانیدار کے پاس لے گیا۔ اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ "حضور' یہ میرا یار خالد ہے۔ اب یہیں رہا کرے گا۔ آپ کو سلام کرنے آیا ہے۔"

خالد نے جھک کر سلام کرتے ہوئے ایک لفافہ پیش کیا۔ تھانیدار نے لفافہ لیا پھر اسے ایک چھڑی جماتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے جاؤ۔ محلے کے معزز لوگوں کا خیال رکھنا انہیں کسی قسم کی شکایت نہ ہو۔"

اس نے نہایت شریفانہ انداز میں وہاں رہائش اختیار کی۔ علاقے کے لوگوں سے میل جول بڑھانے لگا۔ چونکہ ڈھنگ کا لباس پہنتا تھا' گفتگو کا سلیقہ جانتا تھا' اس لئے وہاں کے شریف اور معزز لوگوں کو بھی متاثر کرنے لگا۔ معزز لوگ جانتے تھے کہ وہ گلو دادا کا آدمی ہے' ضرور کوئی غلط دھندا کرتا ہوگا لیکن انہوں نے آنکھوں سے نہیں دیکھا تھا۔ آنکھوں سے دیکھنے پر وہ متاثر کر دیتا تھا' جو لوگ پہلے سے پڑیاں بیچتے تھے' انہوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ ایک آدھ بار جھگڑا بھی کیا مگر اس نے گلو دادا کی مدد سے ہر مخالف کو کچل دیا۔

ہر علاقے کی طاقت وہاں کے نوجوان ہوتے ہیں۔ اس علاقے میں نوجوانوں کی ایک مضبوط تنظیم تھی جو منشیات فروشوں کے خلاف آواز اٹھاتی رہی تھی۔ خالد رفتہ رفتہ اس تنظیم کے جوانوں میں پھوٹ ڈالنے لگا۔ وہاں کی کرکٹ ٹیم کو دو ہزار روپے دیئے اور اس کی سرپرستی قبول کی۔ نوجوان دو گروہوں میں بٹ گئے۔ منشیات کے خلاف بولنے والا گروہ کمزور تھا۔ کیونکہ وہ جذباتی جوان تھے' اس علاقے میں دو داداؤں کی حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے اور سمجھ بھی لیتے تو کیا کر لیتے؟

اس نے ایک برس میں ایسی دھاک جمالی کہ اس علاقے میں گلو دادا سے زیادہ اس کا نام گونجنے لگا۔ اب وہ چھوٹی چھوٹی پڑیا نہیں بیچتا تھا۔ تھوک مال خرید کر اپنے

حواریوں کو بیچنے کے لئے دیتا تھا۔ ہیروئن کے تھوک بیوپار میں لاکھ دو لاکھ روپے گردش کرتے رہتے ہیں۔ منافع کی رقم الگ ہوتی ہے۔ ایک گلو دادا کی مہربانی سے وہ دیکھتے ہی دیکھتے لکھ پتی بن گیا تھا۔ اور اسے آگے بڑھانے والا صرف نام کا دادا رہ گیا تھا۔ وہ محض دنگے فساد کے وقت کام آتا تھا۔ اس علاقے میں جو بھی تھانیدار آتا تھا وہ چل کر خالد سے ملنے آتا تھا۔ کیونکہ اب اس کے حواریوں کے پاس سات ایم ایم کی رائفلیں اور خود اس کے پاس کلاشنکوف جیسے ہتھیار تھے اور وہ تھانے والوں سے کہتا تھا وہ جب چاہیں اس کے گھر کی تلاشی لے سکتے ہیں اور تلاشی لینے والے جانتے تھے کہ اس کے گھر سے کوئی قابلِ اعتراض چیز برآمد نہیں ہوگی۔ وہ علاقے کا معزز غنڈہ تھا خود کو ہر الزام سے بچائے رکھتا تھا چونکہ وہ ملزم نہیں تھا اس لئے معزز تھا۔

اس نے دو ہزار گز کے پلاٹ پر شاندار کوٹھی بنوائی تھی۔ کوٹھی میں ہر طرح کی آسائش کا سامان تھا۔ صرف ثمینہ نہیں تھی۔ وہی ایک ہستی تھی جس کی خاطر بدنصیبی کے دور میں اس نے گالیاں سنی تھیں۔ لات جوتے کھائے تھے' اپنی عزتِ نفس کو مار ڈالا تھا' اپنے اندر غیرت نام کی کوئی تحریک پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ وہ خود کو ہر طرح سے مار کر زندہ تھا۔ گویا اس شعر کی تفسیر تھا۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

اس نے خود کو مٹا کر سب کچھ پا لیا تھا۔ اس کے پاس دولت بڑھتی جا رہی تھی۔ جائیداد پھیلتی جا رہی تھی۔ کئی بار ذلتیں برداشت کرنے کے بعد وہ اپنی عزت کروانا سیکھ گیا تھا۔ جسے پولیس والے سلام کرتے ہیں' اسے ساری دنیا جھک کر سلام کرتی ہے۔

لیکن شاعر نے ہستی مٹانے یعنی خود کو مثبت مقاصد میں گم کر دینے کے لئے کہا تھا۔ ہمارے ہاں ایسی مثالیں ہیں کہ کچھ لوگ نیک مقاصد کے لئے دانے کی طرح خاک میں مل جاتے ہیں اور گلِ گلزار ہو جاتے ہیں۔ فی زمانہ لوگ اپنی عزت کو خاک میں ملاتے ہیں۔ چور بازاری' اسمگلنگ' منشیات فروشی اور اسلحے کی نمائش کرتے ہوئے دہشت گردی کے ذریعے اپنے اپنے علاقے میں جبراً عزت حاصل کرتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ نیک مقاصد کوئی معنی نہیں رکھتے۔ عزت کروانے کے لئے باپ دادا کی

عزت کو خاک میں ملانا چاہئے۔

خالد نے ریڈیو کلر ٹی وی' وی سی آر' فریج' واشنگ مشین اور ایسا ہی بے شمار قیمتی نمائشی سامان خریدنا شروع کیا۔ یہ سب کچھ اس کی کوٹھی میں پہلے سے موجود تھا' اب یہ خاص طور پر ثمینہ کے لئے خرید رہا تھا تاکہ بھابی جان یہ بہانہ نہ کریں کہ ابھی ثمینہ کا جہیز جوڑنے میں وقت لگے گا۔ گھر والے اسے حقارت سے دیکھا کرتے تھے۔ اسے ناکارہ اور ہڈحرام کہتے تھے۔ اب وہ اپنے ساتھ ایسی کوئی کمزوری رکھنا نہیں چاہتا تھا جس کے باعث ثمینہ پھر اس سے دور کر دی جائے۔

مختصر یہ کہ وہ ایک بڑے سے ٹرک میں سارا سامان لدوا کر دو سال بعد اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔

☆------☆------☆

گھر کے ہر فرد پر دہشت طاری تھی۔ بڑے بھائی احمد یار خان اور منجھلے بھائی اسد یار خان کلاشنکوف دیکھتے ہی ڈر کے مارے دیوار سے جا لگے تھے۔ دونوں بھابیاں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ خالد کی انگلی ٹرائیگر پر تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ آج وہ اپنے بھائیوں اور بھابیوں میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔

دوسرے کمرے میں ان کی جوان بیٹیاں اور بیٹے موجود تھے۔ ایک خطرناک ہتھیار دیکھتے ہی سب کے سب کمرے سے نکل آئے۔ اپنے اپنے والدین کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو گئے فیصل نے کہا۔ "چچا جان! اللہ کے لئے اسے رکھ دیجئے۔ ہم سب آپ سے محبت کرتے ہیں۔ آپ کو قاتل کے روپ میں نہیں دیکھ سکتے۔"

سائرہ نے کہا۔ "چچا جان! میرے سوال کا سمجھ کر جواب دیجئے' اگر آپ کے پاس یہ ہتھیار نہ ہوتا تو آپ کس طرح اپنا حق حاصل کرتے؟"

خالد نے کہا۔ "میرے بچو! مجھے مجبوری اور بے بسی کی انتہا کو پہنچایا گیا ہے۔ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے۔"

فائزہ نے کہا۔ "آپ ثمینہ خالہ کی خاطر اس انتہا کو پہنچ گئے ہیں لیکن ہم نادان بچے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک پھول کو حاصل کرنے کے لئے بارود کے دھماکے کئے جائیں تو پورا گلشن اجڑ جاتا ہے۔"

"یہ کتابی باتیں ہیں۔"

"لیکن یہ باتیں آج ہمارے شہر میں جگہ جگہ ہو رہی ہیں۔ آج جن کے ہاتھوں میں کلاشنکوف ہے' وہ پورے شہر کو دہشت زدہ کئے ہوئے ہیں۔"

"اور میں پورے گھر کو دہشت میں مبتلا کر رہا ہوں۔ ایسا اس لئے ہو رہا ہے کہ مجھے اس گھر سے میرا حق نہیں مل رہا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ میں ثمینہ کی خاطر اس گھر سے نکلا تھا اور اسی کے لئے واپس آیا ہوں۔ آج میں ناکارہ نہیں ہوں۔ ہزاروں' لاکھوں روپے کما رہا ہوں۔ میرے پاس وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جن کے ذریعے میں اپنی شریک حیات کو ہمیشہ خوش رکھ سکتا ہوں۔ میں نے تین برس میں واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس سے پہلے تمہارے بزرگوں نے ثمینہ کی کہیں منگنی کر دی ہے۔ ان کی وعدہ خلافی ان کی کم ظرفی کا کھلا ثبوت ہے۔ یہ سمجھتے تھے' میں واپس آ کر چیختا چلاتا اور تڑپتا رہ جاؤں گا مگر ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ اب ان کی سمجھ میں آ جانا چاہئے کہ میں رونے اور تڑپنے والا دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ تم سب مجھے سمجھانے کے بجائے اپنے والدین کو سمجھاؤ۔"

تمام بچے اپنے والدین کی طرف گھوم گئے۔ انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ وہ والدین سے کم بولتے تھے۔ بعض حالات میں ان کی خاموشی بزرگوں کو بہت کچھ سمجھا دیتی تھی۔ احمد یار خان نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "بیگم! دو برس پہلے خالد نے اسی کمرے میں ہم پر چاقو نکالا تھا۔ اس وقت بھی ہمارے بچوں نے اپنے چچا اور ثمینہ خالہ کی دبی زبان میں حمایت کی تھی۔ آج بھی یہ ہمارے سامنے ڈھال بنے ہوئے ہیں لیکن محبت چچا سے کر رہے ہیں۔ اب ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہماری بے جا ضد نے خالد کو چاقو کے مرحلے سے کلاشنکوف کے مرحلے تک پہنچا دیا ہے۔"

اسد یار خان نے کہا۔ "بھائی جان' آپ درست کہتے ہیں۔ ہمیں اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہئے۔ ہم اس گھر کو جہنم نہیں بنائیں گے۔ خالد! یہ ہتھیار رکھ دو۔ ثمینہ کی منگنی نہیں ہوئی ہے۔"

خالد نے چونک کر بھابی جان کو دیکھا۔ وہ بولیں۔ "ہاں' میں نے جھوٹ کہا تھا۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا۔ وہ سہمی جا رہی تھیں لیکن اس نے پاس آ کر

ان کے قدموں میں ہتھیار کو رکھ دیا۔ پھر گھٹنے ٹیک کر بولا۔ "میں منگنی کی خبر سن کر مشتعل ہوگیا تھا۔ مجھ سے جنون کی حالت میں گستاخی ہوگی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔"

بھابی کے قدموں میں کلاشنکوف تھی۔ اگر وہ معاف نہ کرتیں تو گھٹنے ٹیکنے والا پھر جنون میں ہتھیار اٹھا سکتا تھا۔ وہ بولیں ٹھیک ہے۔ "غلطی ہم سے بھی ہوئی' تم سے بھی ہوئی۔ میں اپنی بہن کی بھلائی کے لئے تمہاری مخالفت کرتی تھی۔ اب نہیں کروں گی۔"

منجھلی بھابی نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے' شادی پکی ہوگئی۔ بھئی مبارک ہو۔"

فیصل' جنید اور دوسرے بھتیجے اپنے چچا سے گلے ملنے لگے۔ وحشت زدہ ماحول میں اچانک ہی عید آگئی۔ سب ایک دوسرے سے ہنستے بولنے لگے۔ لڑکیاں دوسرے کمرے میں آکر ثمینہ سے لپٹ رہی تھیں اور خالہ کے رشتے کو نظرانداز کرتے ہوئے اسے چھیڑ رہی تھیں۔ خالد نے کہا۔ "بھابی جان! میں نے سوچا آپ کو ثمینہ کے جہیز کے سلسلے میں پریشانی ہوگی۔ اس لئے یہ تمام سامان لے آیا ہوں۔"

بھابی نے کہا۔ "دنیا کیا کہے گی۔ میں بہن کو تم سے بیاہوں گی اور تم سے ہی اس کا جہیز لے کر تمہی کو دوں گی۔"

اس نے کہا۔ "ثمینہ کے سرپرست بھائی جان ہیں' لہٰذا یہ جہیز بھائی جان کی طرف سے دیا جائے گا۔"

بڑے بھائی نے خوش ہو کر کہا۔ "ہاں' یہ سب کچھ میری طرف سے ثمینہ کو دیا جائے گا۔"

بھابی نے پوچھا۔ "تم نے اتنی ترقی کیسے کرلی؟ آخر تم کرتے کیا ہو؟"

"کاروبار کرتا ہوں۔"

بھائی جان نے پوچھا۔ "کیا کاروبار ہے تمہارا؟"

اس نے جواب دیا۔ "صاف ستھرا کاروبار ہے۔ ایک طرف سے مال خریدتا ہوں دوسری طرف بیچ دیتا ہوں۔"

"ایک بار ایک بدمعاش نے میرا راستہ روک کر کہا تھا کہ تم جیل میں ہو۔" بڑے بھائی نے کہا۔

"آپ اس بدمعاش کی صورت ایک بار دکھا دیں۔ وہ پھر اس شہر میں دکھائی

نہیں دے گا۔"

منجھلے بھائی نے کہا۔ "تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے اس شہر میں تمہاری حکومت ہے۔"

"بے شک' یہاں اسی کا رعب اور دبدبہ ہے جس کے پاس کلاشنکوف ہے۔"

بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم کچھ زیادہ ہی خطرناک ہوگئے ہو یہ بتاؤ' اتنے عرصے تک کہاں رہے؟"

"اپنی کوٹھی میں۔"

"اپنی کوٹھی!" سب نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ بھائیوں اور بھابیوں نے اسے اپنے گھر سے بے دخل کرنے' اس کا حصہ ہڑپ کرنے کے لئے بڑی سازشیں کی تھیں۔ خالد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں نے دو ہزار گز کے پلاٹ پر ایک شاندار کوٹھی بنوائی ہے کہ آپ لوگ دیکھتے ہی رہ جائیں گے۔"

سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔ خالد نے اپنے بھتیجوں سے کہا۔ "ہمارے گھر میں جتنے افراد ہیں ان کے حساب سے ٹیکسیاں لے آؤ۔ میں اپنی کوٹھی میں لے چلوں گا۔"

آدھے گھنٹے میں پانچ ٹیکسیاں آگئیں۔ خالد نے اپنے والد صمد یار خان کو اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میری کمائی اور کوٹھی پر سب سے پہلے آپ کا حق ہے۔ جب ساری دنیا مجھے کھوٹا سکہ کہتی تھی تب بھی آپ نے مجھے عاق نہیں کیا تھا۔"

کوٹھی کے سامنے گاڑیاں آکر رکیں۔ خالد کے کتنے ہی حواریوں نے آکر گاڑیوں کے دروازے کھولے۔ آنے والوں کو ادب سے سلام کیا۔ وہ سب اس کوٹھی کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے زندگی میں پہلی بار ایک عالیشان محل کو دیکھ رہے ہوں۔ وہ ان کی توقع سے بہت زیادہ تھا۔ کوٹھی کے اندر پہنچ کر وہ ایک ایک کمرے کو اور قیمتی آرائشی سامان کو دیکھ دیکھ کر حیرت اور مسرت کا اظہار کرتے جارہے تھے۔ اب کوئی یہ نہیں پوچھ رہا تھا کہ یہ تمام سامان کہاں سے آیا ہے؟ اتنی شاندار کوٹھی کیسے بن گئی ہے؟ اور اس کے پاس کلاشنکوف جیسا ہتھیار کیوں ہے؟ وہ چاروں طرف گھوم گھوم کر کوٹھی کو اور باغیچے کو دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "اللہ جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

صمد یار خان عینک لگائے چپ چاپ دیکھ رہے تھے۔ خالد نے کئی بار انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ توقع کر رہا تھا کہ باپ کی طرف سے بھی داد ملے گی۔ واپسی پر اس نے پوچھا۔ "ابا جان! آپ کو میری کوٹھی پسند آئی؟"

"یہ جسے تم کوٹھی کہتے ہو' یہ تمہارے دور کا مکان ہے۔ مجھے میرے دور کا اپنا پرانا مکان پسند ہے۔"

"کیا آپ کو اپنے بیٹے کی ترقی سے خوشی نہیں ہوئی؟"

"یہ تمہارے دور کی ترقی ہے۔ اس سے میرے دور کا کوئی بوڑھا خوش نہیں ہوگا۔"

"کیا آپ سمجھتے ہیں' یہ میری حرام کی کمائی ہے؟"

"یہ سمجھنے کے لئے بہت زیادہ عقل کی ضرورت نہیں ہے۔ باپ ساری عمر کی کمائی کے بعد سو گز کے پلاٹ پر مکان بناتا ہے اور بیٹا صرف دو سال میں دو ہزار گز کے پلاٹ پر محل بناتا ہے تو ایمانداری اور بے ایمانی کا فرق صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔"

وہ تھوڑی دیر کھانسنے کے بعد بولے۔ "میں ایک بات تمہارے کان میں کہنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کان میں کیوں کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں نہیں چاہتا' یہ بات تمہارے بھائیوں کو اور دوسرے رشتے داروں کو معلوم ہو۔"

خالد ان کے قریب جھک گیا۔ اپنا کان قریب لے آیا۔ وہ دھیرے دھیرے تھرتھراتی ہوئی آواز میں کچھ کہنے لگے۔ وہ بات تھی یا بوڑھے باپ کی لات تھی جس کی ٹھوکر دل پر پڑ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت بلندی سے انتہائی پستی کی طرف گرتا جا رہا تھا۔

پھر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ باپ کو تکنے لگا۔ بوڑھے باپ کی آنکھیں اور عینک آنسوؤں سے بھیگتی جا رہی تھیں۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہے تھے اور کھانس رہے تھے' انہوں نے جو کچھ کہا تھا' اسے کہنے کے بعد کسی عذاب میں مبتلا ہو گئے تھے۔

وہ دوسرے دن اپنی آمنہ آپا سے ملنے آگیا۔ آپا نے اس کی آمد پر خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بولا۔ "میں نے سنا ہے' آپ کسی کوٹھی میں کام کرتی ہیں؟"

"کیا اب تم اعتراض کرنے آئے ہو؟"

"آپا! انسان اپنے بدترین حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے وقتی طور پر اپنی سطح سے گر جاتا ہے۔ یہ ہماری اور ظہیر بھائی کے رشتے داروں کی کم ظرفی ہے کہ انہوں نے آپ لوگوں سے تعلقات ختم کر لئے۔ بہرحال جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب آپ کا یہ بھائی دولت' عزت اور شان و شوکت میں کسی سے کم نہیں ہے۔ میں اپنی بھانجیوں کی شادی میں لاکھوں روپے کا جہیز دے سکتا ہوں۔"

"خالد! گھر میں تمہارے کسی بزرگ نے یہ نہیں پوچھا کہ تمہارے پاس اتنے کم وقت میں لاکھوں روپے کہاں سے آگئے؟"

"ہمارے ملک میں یہ قانون نہیں ہے کہ لوگوں کے پاس اچانک آنے والی دولت کا حساب لیا جائے۔ جہاں قانونی محاسبہ ہوتا ہے وہاں محلے داروں اور گھر کے بزرگوں کا محاسبہ بھی برائے نام ہوتا ہے۔"

آمنہ نے کہا۔ "کل فیصل نے آکر بتایا تھا کہ تم کتنے امیر کبیر ہو گئے ہو۔ بھائیوں ور بھابیوں نے ثمینہ سے تمہاری شادی کا فیصلہ بھی سنایا ہے۔ میں بھی ایک فیصلہ سنانا چاہتی ہوں۔ پہلے میری بات کا چند لفظوں میں جواب دو۔ کیا تمہارا تعلق ڈرگ مافیا سے ہے؟"

"آپ کا خیال ڈرگ مافیا کی طرف کیوں گیا؟"

"ہم کھلی آنکھوں سے زمانے کو دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے شہر میں جس کے اِس دولت اور کلاشنکوف ہو' کیا وہ مومن ہوگا؟ میری بات کا جواب ہاں یا نہ میں دو۔"

"آپ درست سمجھ رہی ہیں۔"

آمنہ نے سختی سے ہونٹوں کو بھینچ لیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس نے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "میرے بھائی! آج کے بعد میرے دروازے پر نہ آنا۔"

وہ چونک کر بولا۔ "یہ............ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"میرے گھر میں جوان بیٹیاں ہیں۔ ایک کی شادی ہونے والی ہے۔ دوسری کا شتہ بھی ایک اچھے گھرانے سے آیا ہے۔ اگر ان کی سسرال والوں کو معلوم ہوا کہ ان

کاماموں منشیات فروش ہے اور اسلحے کے بل پر دہشت پھیلاتا ہے تو تمہارا کچھ نہیں جائے گا تم آج کے ہیرو ہو مگر میری بچیاں عمر بھر بیٹھی رہ جائیں گی۔"

"یہ آپ کا خیال ہے۔ ورنہ جہاں دولت آتی ہے' اس گھر کی لڑکیوں کے لئے رشتوں کی لائن لگ جاتی ہے۔"

"میں اس لائن کے کسی رشتے کو اپنے دروازے پر نہیں آنے دوں گی۔ تم جیسے دولت مندوں کے لئے میں کوٹھی میں کام کرنے والی ملازمہ ہوں۔ اپنی سطح سے گر گئی ہوں۔ یہ بات کبھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی کہ تم لوگ اپنی سطح سے گر کر دولت حاصل کرتے ہو۔"

"آپا! میں نادان نہیں ہوں۔ یہ سمجھتا ہوں کہ انسانیت سے گرنے کے بعد ہی مجھے یہ اندھی دولت مل رہی ہے مگر کیا کروں۔ میں نے بہت مجبور ہو کر........"

آمنہ نے ہاتھ اٹھا کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بس آگے نہ کہنا۔ تم مجھ جیسی بیٹیوں کی ماؤں سے زیادہ مجبور نہیں ہو سکتے تم نے بھائیوں اور بھابیوں کو منہ توڑ جواب دینے اور ثمینہ کو حاصل کرنے کی ضد میں ایسا کیا ہے۔ تم مجبور نہیں تھے۔ ہمارے ملک میں بے شمار تعلیم یافتہ نوجوان بے روزگار ہیں۔ تمہاری طرح ان نوجوانوں کے خوابوں میں بھی کوئی نہ کوئی ثمینہ ہوگی۔ حالات ان کے خوابوں کو چکنا چور کرتے ہوں گے۔ ناکامی انہیں طیش دلاتی ہوگی۔ نامرادی انہیں مشتعل کرتی ہوگی۔ اس کے باوجود یہ تمہاری راہ پر کیوں نہیں چلتے؟ کیا بزدل ہوتے ہیں؟ نہیں' یہ ایمان والے ہوتے ہیں۔ کیا یہ دولت نہیں چاہتے؟ نہیں' یہ قناعت پسند ہوتے ہیں صرف خوشحالی چاہتے ہیں۔ اپنی ذہانت سے' اپنی صلاحیتوں سے اور کسی نہ کسی تدبیر سے جینے کی راہ نکالتے ہیں۔ بہرحال' میں بولتی چلی جاؤں گی اور تمہارے پاس میری کسی بات کا معقول جواب نہیں ہوگا۔ جب تک تم موجودہ راستے پر چلتے رہو گے' ہم ندی کے دو کنارے بن کر رہیں گے۔"

"آپا! میں آپ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ اگر چھوٹے غلطی کریں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان سے رشتہ ختم کر دیا جائے۔"

"تمہیں غلطی کا احساس ہے مگر غلطی سے باز آنے کا ارادہ نہیں ہے۔ جب ارادہ کرلو اور اس پر عمل بھی کرو تو میرے پاس آنا' میں ماں بن کر تمہارا استقبال کروں گی۔

فی الحال اللہ حافظ۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ خالد کو بھی اٹھنا پڑا۔ اس کے پیچھے پیچھے دروازے کے باہر آنا پڑا۔ بہن نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ پلٹ کر دروازے پر آئی۔ پھر مزید کچھ کہے بغیر اس کے پٹ بند کر دیئے' وہ اپنی آپا سے بہت پیار کرتا تھا۔ آج وہ پیار کے رشتے سے ٹوٹ کر جا رہا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا لیکن پچھتاوا نہیں تھا۔ اس نے بڑی گالیاں سن کر لاتیں جوتے کھا کر بھنگی بن کر یہ دولت حاصل کی تھی اور اب ثمینہ حاصل ہونے والی تھی للذا اور پچھتانے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شام کو صمد یار خان اور زلیخا بی کے متعلق پنچائت اپنا فیصلہ سنانے والی تھی۔ فیصل اور جنید نے خالد سے کہا۔ "چچا! آپ اس پنچائت میں ضرور جائیں' ہو سکے تو کلاشنکوف ساتھ لے جائیں' جو ہمارے دادا جان کے خلاف بولے' اسے دھمکی دیں۔ یہ سمجھانے کی کوشش کریں کہ دو بوڑھوں کا آپس میں مل بیٹھنا گناہ نہیں ہے۔ ہاتھ میں ہتھیار لے کر سمجھاؤ تو بات جلدی سمجھ میں آجاتی ہے۔"

خالد اس پنچائت میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس معاشرے میں مرد اور عورت کو مل بیٹھنے کی اجازت نہیں ملتی خواہ وہ بوڑھے ہی کیوں نہ ہوں۔ چونکہ باپ کا معاملہ تھا۔ دوسرے بھائی شریک ہو رہے تھے اس لئے وہ بھی شریک ہو گیا۔

پنچ میں سے ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے کہا۔ "ہماری گندی گلی میں بڑے میاں نے جو شرمناک حرکت کی ہے۔ اس کے چشم دید گواہ یہاں موجود ہیں۔ یہاں ان کے تینوں صاحبزادے بھی موجود ہیں۔ اگر یہ اپنے والد کی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہیں تو ہم ان کی بات ضرور سنیں گے۔"

بڑے بیٹے احمد یار خان نے کہا۔ "میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہوں گا لیکن مجھے اس محلے کے گمنام نوجوانوں کا ایک خط ملا ہے' اس میں لکھا ہے کہ ایسے ہی خطوط یہاں کے تمام بزرگوں کے نام روانہ کئے گئے ہیں۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "یہ چند سرپھرے نوجوانوں کی شرارت ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ صمد یار خان کو زلیخا بی سے ملنے جلنے کی اجازت دی جائے۔"

دوسرے بزرگ نے کہا۔ "آج کل کے جوان ویڈیو فلمیں دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہاں کے بوڑھے بھی ہیرو ہیروئن کا تماشا کرتے رہیں۔ لعنت ہے ایسے جوانوں

پر............"

ایک اور بزرگ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں' صمد یار خان کے پوتے فیصل اور جنید نے چند نوجوانوں کا ایک گروہ بنایا ہے۔ اس گروہ نے ہم سب کے نام یہ خطوط بھیجے ہیں۔"

خالد نے کہا۔ "اس گروہ میں آپ لوگوں کے جوان بچے بھی ہو سکتے ہیں' انہوں نے خطوط میں اپنا نام نہیں لکھا۔ نام لکھتے تو اپنے بزرگوں کے خلاف کھلم کھلا محاذ بن جاتا۔ انہوں نے آپ لوگوں کی بزرگی کا پاس رکھتے ہوئے صرف یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دو معصوم بوڑھے جذبوں سے ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے ہیں۔ ان کی نیت پر شبہ نہ کیا جائے۔ انہیں ملنے کی اجازت دی جائے۔"

پنچ کے ایک شخص نے کہا۔ "کیا کسی کے دل میں کوئی جھانک کر دیکھ سکتا ہے کہ اس کی نیت کیسی ہے؟"

دوسرے نے کہا۔ "نیت کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں مرد اور عورت کا کھلے عام گلی میں بیٹھنا بے حیائی ہے۔ میاں بیوی بھی اس طرح گلی میں نہیں بیٹھتے جس طرح صمد یار خان بیٹھنا چاہتے ہیں۔"

راشد نے کہا۔ "یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میری والدہ کو اس بڑھاپے میں بدنام کیا جا رہا ہے۔ میں تو اس محلے میں مکان خرید کر پچھتا رہا ہوں۔"

"تمہیں پچھتانا نہیں پڑے گا۔ ہم پنچوں کا فیصلہ ہے کہ صمد یار خان کے بیٹے اپنے باپ کو تالے چابی میں رکھیں اور گلی میں نہ آنے دیں۔ اس فیصلے پر تمام حاضرین کے دستخط ہوں گے۔ اگر صمد یار خان کو کبھی گلی میں دیکھا گیا تو یہ معاملہ تھانے اور کچہری تک پہنچا دیا جائے گا اور محلے والے صمد یار خان کے تمام گھر والوں سے صاحب سلامت ترک کر دیں گے۔"

سب نے اس فیصلے سے اتفاق کیا۔ ایک کاغذ پر فیصلہ لکھا گیا وہاں حاضر ہونے والے اس کاغذ پر دستخط کرنے لگے۔ تینوں سے دستخط کرائے گئے۔ صمد یار خان نے پوچھا۔ "کوئی مجھے بھی بتائے کیا فیصلہ ہو رہا ہے؟"

ایک صاحب نے کان کے پاس چیخ کر کہا۔ "آج سے آپ گندی گلی میں نہیں جائیں گے۔ آپ کے بیٹے پچھلے دروازے پر تالا ڈالیں گے۔"

وہ چھڑی کا سہارا لے کر تھرتھراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ پھر بولے۔ "اے لوگو! یہ کیسا احمقانہ فیصلہ ہے۔ اگر میں گندا ہوں تو مجھے گندی گلی میں جانے دو۔ جب تم تمام گندگی وہاں پھینکتے ہو تو مجھے بھی وہاں پھینک کر بھول جاؤ اور اگر میں گندا نہیں ہوں تو پھر مجھ پر پابندی کیسی؟"

انہوں نے پنچوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میرے خلاف فیصلہ کرنے سے پہلے گندی گلی کو ختم کرو مگر تم ایسا نہیں کرو گے۔ اگر کرو گے تو اپنے اپنے دماغ کا کچرا کہاں پھینکو گے؟"

وہ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولے۔ "میں دعوے سے کہتا ہوں۔ تمہارے فیصلے پر وہ تمام بوڑھے دستخط نہیں کریں گے' جن کی جوان اولاد انہیں گھر کے صحن یا اسٹور روم میں رکھ کر بھول گئی ہے۔"

وہ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "لوگو! سنو' ہم بوڑھے نہیں' بیمار ہیں۔ زلیخا' راشد کی ماں نہیں' ایک نرس ہے۔ جب خود غرض رشتے دار اسپتال میں پھینک کر چلے جاتے ہیں تو یہ نرس ہمارے لئے مسکراتی ہے۔ دنیا نہ پوچھے مگر یہ ہمارا حال پوچھتی ہے۔ ہماری کلائی تھامتی ہے۔ ہمارے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ ہمیں جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔ اگر تمہارے معاشرے میں کھلے عام مرد اور عورت کا قریب آنا جرم ہے تو اسپتالوں سے نرسوں کا وجود ختم کر دو۔"

وہ کھانسنے لگے۔ پھر بولے۔ "اے لوگو! ذرا سوچو' ہم اپنی زندگی کے آخری سفر میں ہیں اور زلیخا ایک ایئر ہوسٹس ہے۔ وہ مسکراتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ ہمارا سفر آرام سے کٹ جائے گا۔ وہ محبت سے ہمارا حال پوچھتی ہے۔ کوئی تکلیف یا پریشانی ہو تو اسے دور کرتی ہے۔ پوری ذمے داری اور فرض شناسی کے ساتھ ہمیں منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ ہماری ماں نہیں ہوتی' بہن نہیں ہوتی' بیوی نہیں ہوتی اور محبوبہ نہیں ہوتی۔ پھر بھی کھلے عام ہماری رفیقِ سفر ہوتی ہے اور یہ جرم نہیں ہوتا۔ پھر تم لوگ مجھے کس جرم کی سزا دے رہے ہو؟"

وہ بول رہے تھے' بولتے جا رہے تھے۔ کھانس رہے تھے اور بلغم تھوکتے جا رہے تھے۔ خالد ان سے دور سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بڑے بھائیوں نے باپ کو دونوں طرف سے تھام کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "چپ ہو جائیں۔ خدا کے لئے چپ

ہو جائیں' یہاں کوئی نہیں ہے۔ سب جا چکے ہیں۔"

"آں؟" صدیار خان کے ذہن میں جھٹکا لگا۔ "کوئی نہیں ہے۔ کوئی سننے والا اور انصاف کرنے والا نہیں ہے۔"

"زلیخا!" ان کے دل پر ایک گھونسہ لگا۔ زلیخا کے آخری حرف پر ان کا پوپلا منہ کھلا رہ گیا۔ دیدے پھیل کر ساکت ہو گئے۔ زلیخا کوئی شجرِ ممنوعہ نہیں تھی' محض آکسیجن تھی۔ ایک بوڑھے کی ناک سے آکسیجن کی نلکی ہٹالی گئی تھی اور اس نے پھڑپھڑا کر دم توڑ دیا تھا۔

تم........ لوگو تم! اپنے بوڑھوں کو کچھ نہیں دے سکتے۔ کتنے قلاش ہو کہ اخلاقی آکسیجن بھی نہیں پہنچا سکتے۔

☆------☆------☆

صبح کے چار بجنے والے ہیں۔ گندی گلی میں ایک سرے سے دوسرے تک ایسی آوازیں آرہی ہیں جیسے کئی خاکروب جھاڑو لگا رہے ہوں۔ کچروں سے اُڑنے والی گرد انہی گھروں میں جا رہی ہے' جہاں سے کچرے پھینکے گئے تھے۔ اکثر لوگ یہ سمجھ نہیں پاتے کہ وہ اپنے اندر کی گندگی باہر پھینکیں گے تو وہ ہوا کے دوش پر پھر ہماری سانسوں میں آئے گی۔

خالد جاگ رہا ہے۔ اس نے تمام رات سونے کی کوشش کی۔ کروٹیں بدلتا رہا۔ دو عدد خواب آور گولیاں بھی کھائیں لیکن بات نہ بنی۔ کوئی کتنی ہی دولت کمائے مگر اس کی زندگی میں ایسی راتیں آتی ہیں' جب اس کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ اسے خواب آور گولیاں اور ماں کی لوریاں سُلا نہیں پاتیں۔

اس کے قریب ثمینہ سو رہی ہے۔ دونوں کے درمیان ان کا نوزائیدہ بیٹا بھی محوِ خواب ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سارا وقت گزر چکا ہے۔ دولت بھی مل گئی' شادی بھی ہو گئی' بچہ بھی ہو گیا۔ شادی کے بعد بچے نہیں رکتے' ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دولت ملنے کے بعد عزت نہیں رکتی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اب خالد کی زندگی میں کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ اس کے باوجود آج اس کی نیند اُڑ گئی ہے۔

وہ بستر سے اٹھ کر میز کے پاس آگیا ہے اور کرسی پر بیٹھ کر ڈائری کا خالی صفحہ کھول رہا ہے اور اس پر لکھ رہا ہے۔ "آج میں بہت پریشان ہوں۔ یہ سنا ہے اور پڑھا

ہے کہ ہم جیسوں کو مرنے کے بعد جہنم کی آگ میں پھینکا جائے گا۔ آج میں جیتے جی اپنے اطراف جہنم کی آنچ محسوس کر رہا ہوں۔ اس احساس کا سبب میرا ضمیر نہیں ہے بلکہ میرے پاس ضمیر نام کی کوئی چیز ہی نہیں ہے۔

ایسی بات بھی نہیں ہے کہ میں اچانک اللہ سے ڈرنے لگا ہوں۔ ہم جیسے لوگ خود نہیں ڈرتے' دوسروں کو اللہ کے غضب سے ڈراتے ہیں۔ ایسی بات بھی نہیں ہے کہ دولت سے جی بھر گیا ہے۔ دولت سے پیٹ بھرتا ہے' جی نہیں بھرتا۔ یہ کمبخت جتنی ملتی ہے' اتنا ہی لالچ بڑھتا جاتا ہے۔ میں نے دو ہزار گز کے پلاٹ پر بنی ہوئی کوٹھی فروخت کر دی ہے اور ڈیفنس میں ایک شاندار کوٹھی خرید لی ہے۔ یعنی اپنی عزت اور شان و شوکت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ یہاں کوئی میرے ماضی میں جھانکنے والا نہیں ہے۔ کوئی میرے کاروبار کے متعلق پوچھنے والا نہیں ہے کیونکہ اس علاقے میں سبھی عزت دار اور خاندانی لوگ رہتے ہیں۔ میں یہاں اعلیٰ نسل کا انسان بن چکا ہوں۔

میں یقین سے کہتا ہوں۔ جب تک محنت اور حلال کی روزی کمانے والی آمنہ آپا اور ظہیر بھائی پر انگلیاں اٹھائی جاتی رہیں گی تب تک ہم پر انگلیاں اٹھانے والی حساس قوم پیدا نہیں ہوگی ابھی ہم کھل کر کما رہے ہیں اور عیش کر رہے ہیں۔ جس میں دم ہو وہ ہمارا گریبان پکڑنے آئے' ہم ایک فون کریں گے اور اسے حوالات میں پہنچا دیں گے۔

لیکن اب میرا خون جوش مار رہا ہے۔ ثمینہ نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں' کیا یہ جوان ہو کر ہیروئن کی پڑیاں بیچے گا؟ اگر یہ ضمیر فروش ہو گا تو میرے نقشِ قدم پر چلے گا۔ اگر محبِ وطن ہو گا تو میرا ہتھیار لے کر مجھے گولی مار دے گا۔

میں اپنے بیٹے کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا اور بیٹے کو منشیات فروش نہیں بنانا چاہتا۔ میں نے جو کیا' دولت کے حصول کے لئے کیا۔ میں پیشہ ور مجرم نہیں ہوں کہ اپنی اولاد کو بھی مجرم بنا دوں۔

یہ تو بیٹے کی بات ہے کل بیٹی پیدا ہو سکتی ہے ایک نہیں' کئی ہو سکتی ہیں۔ میں ہاتھ میں کلاشنکوف لے کر ثمینہ کو دھمکی نہیں دے سکتا' خبردار! بیٹی پیدا نہ کرنا ان کا رشتہ کبھی شریف گھرانوں سے نہیں آئے گا۔ میری بیٹیاں میرے ہی جیسے دولت مند مجرموں

کے خاندان میں بہوئیں بن کر جائیں گی۔ ان کے نصیب میں شرابی اور عیاش خاوند ہوں گے۔

آج آمنہ آپا کی باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ یہ دھندا چھوڑ نہیں سکتا۔ چھوڑوں گا تو بھتے کے طور پر بڑی بڑی رقمیں ادا نہیں کر سکوں گا اور جب ادا نہیں کروں گا تو ایک عام مجرم کی طرح پکڑا جاؤں گا۔ مجھے لات جوتے پڑیں گے پھر ایک بار جیل میں بھنگی کا کام کرنا پڑے گا۔ نہیں' میں جس راستے پر ہوں' وہاں سے واپس نہیں ہو سکتا۔

میرے اباجان مرحوم بہت دانشمند تھے۔ انہوں نے میرے بھائیوں کے کہنے پر مجھے عاق نہیں کیا۔ پھر میری دولت اور شان شوکت دیکھ کر سمجھ لیا کہ آئندہ میری شریکِ حیات مجرموں کی نسل پیدا کرے گی۔ اسی لئے انہوں نے میرے کان میں چپکے سے کہا تھا۔ "خالد! میں تیرا سر بھائیوں کے سامنے جھکانا نہیں چاہتا اور میں مجرم نسل کا دادا نہیں کہلانا چاہتا۔ لہٰذا آج تجھے عاق کرتا ہوں۔ آج سے تُو میرا بیٹا نہیں' تُو اور تیری اولاد میرے نام سے نہیں پہچانی جائے گی۔"

آج مجھے آمنہ آپا اور اباجان مرحوم کی باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں' لیکن بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں نہ آگے جا سکتا ہوں' نہ پیچھے پلٹ کر آ سکتا ہوں۔ ایسی بے بسی کے عالم میں صرف اولاد کے لئے دعائیں مانگ رہا ہوں۔ "میرے معبود! میرے گناہوں کی سزا میری اولاد کو نہ دینا۔ ہماری آئندہ نسل کو ایک تو ہی جرائم سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ میرے مالک! مجھے عذاب دے مگر ہماری نسل کو رحمتوں سے نواز دے............"

وہ ڈائری کے صفحے پر لکھتے لکھتے رک گیا۔ پاس والی مسجد سے فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ اس نے بھیگی آنکھوں سے کھڑکی کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

مئوذن مرحبا' بروقت بولا
تری آواز مکے اور مدینے

☆------☆------☆

بارود کے پھول

ایک جزیرے کے حوصلہ مند اور باہمت لوگوں کی داستان شجاعت۔
ایک بیٹی کے جذبہ حریت کی کہانی جس نے اپنے غدار باپ کو گولی مار دی۔ بارود کی بارش میں محبت کے پھول کھلانے والے دشمن فوجی کی جذبات کو ہلانے والی کہانی۔

آسمان پر نصف چاندیوں لگ رہا تھا جیسے چڑھتی جوانی میں ٹوٹ کر آدھا رہ گیا ہو۔ الوینہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے اس پار چاند کو بڑی شکستہ دلی سے دیکھ رہی تھی کیونکہ وہ بھی بھری جوانی میں ٹوٹ کر آدھی رہ گئی تھی۔ بیوہ کی جوانی جتنی اداس ہوتی ہے اتنی ہی اندر سے غضبناک ہوتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ چاند کی طرح اپنے چمکتے وجود کے پیچھے ٹھنڈی آگ میں جل رہی ہے۔

باہر ہلکی ہلکی برفباری شروع ہو چکی تھی چاندنی میں دور دور تک برف کے ذرات نیلے پتھروں کی طرح چمک رہے تھے ہر طرف ٹھنڈک اور نمی تھی۔ صرف الوینہ کے من میں آگ جل رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں بہت دور ایک ریکریشن ہال سے فوجیوں کے قہقہے لگانے اور مستی میں چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس چھوٹے سے شہر کی مٹھی بھر فوج ملک' قوم اور ذات برادری سے بالا تر ہو کر اور آپس میں متحد ہو کر اپنے ننھے سے جزیرے کی حفاظت کر رہی تھی۔

لیکن اس رات وہ ذرا مستیوں میں ڈوب گئے تھے۔ الوینہ کے باپ ڈیگن پال نے اس رات فوجی جوانوں کو ایک شاندار کاک ٹیل پارٹی دی تھی۔ شراب کے ساتھ خاص طور پر ہرن کا گوشت فراہم کیا گیا تھا۔ اسی لئے اس رات وہ کھل کر پی رہے تھے اور بھنے ہوئے ہرن کی بوٹیاں نوچ رہے تھے۔

ڈیگن پال ایک یہودی تھا۔ بیس برس پہلے اس شہر میں آکر وہ بیوی کے ساتھ آباد ہو گیا تھا اور وہاں کے لوگوں میں گھل مل گیا تھا۔ الوینہ اسی شہر میں پیدا ہوئی' وہیں جوان ہوئی۔ چھ ماہ کی سہاگن بنی پھر بیوہ ہو گئی۔ اس کا شوہر ایک رات شوقیہ مچھلیاں پکڑنے گیا تھا پھر وہ کشتی واپس نہیں آئی۔ مگر انتظار کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ موسم بدلتے رہتے تھے۔ آسمان برف کے ٹھنڈے آنسو دھرتی پر ٹپکاتا رہتا تھا اور وہ گرما گرم آنسو بھری آنکھوں سے سمندر کی طرف جانے والے راستے کو تکتی رہتی تھی۔

اس کے باپ اور اس کی سکھیوں نے اسے بارہا یقین دلایا تھا کہ اس کا شوہر مر چکا ہے۔ سمندر بڑا ظالم ہوتا ہے کسی کا لحاظ نہیں کرتا محبت کو بھی خاموشی سے نگل جاتا ہے رالوینہ کہتی تھی۔

"ہائے ری سکھیو.......... میرا دل نہ توڑو۔ جو راستہ سمندر کی طرف جاتا ہے واپس بھی تو آتا ہے۔ پھر وہ واپس کیوں نہیں آئے گا.......... ضرور آئے گا۔"

وہ کھڑکی سے ٹیک لگائے برفباری کا منظر دیکھ رہی تھی اور نیلے آسمان کے ندلائے ہوئے چاند کو تک رہی تھی۔ پھر اس نے اس دھندلی سی چاندنی میں کچھ نیلے ے دھبے دیکھے۔ وہ آسمان سے ٹپک رہے تھے۔ بہت دور بلندی پر طیارے کی ہلکی سی وازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جشن منانے والے فوجیوں نے ریکریشن ہال کے ر روغل میں وہ آوازیں نہیں سنیں۔ مگر الوینہ اک دم سے چونک کر ان نیلے دھبوں و دیکھنے لگی جو اب واضح طور پر پیراشوٹ نظر آرہے تھے۔

وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے سے نکلی۔ پھر دوسرے کمرے سے گزرتی ہوئی باہر کی رف جانے لگی۔ اس کے مکان کے ساتھ ہی اس کے باپ ڈیگن پال کا ایک بہت بڑا زل سٹور تھا۔ اس جنرل سٹور کے باہر ایک سائرن لگایا گیا تھا تاکہ شہریوں اور فوجیوں و بروقت خطرے سے آگاہ کیا جاسکے۔ سائرن کو آن کرنے کے لئے جنرل سٹور کے ندر جانا ضروری تھا لیکن اس سٹور کے تمام دروازے بند تھے شاید ڈیگن پال بھی کان کو تالا لگا کر ریکریشن ہال کی طرف چلا گیا تھا۔

الوینہ نے اسٹور کے بند دروازوں کو دیکھ کر سوچا کہ وہ دوڑتی ہوئی ناظم اعلیٰ کی وٹھی تک جائے۔ کیونکہ وہاں بھی ایک سائرن لگایا گیا تھا مگر اس کے سوچتے سوچتے ہی ائرنگ شروع ہو گئی۔ ریکریشن ہال کی طرف زبردست دھماکے ہوئے۔ الوینہ اپنا ؤازن نہ سنبھال سکی۔ برف کی بھربھری زمین پر گر پڑی۔ اس نے ہانپتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا جہاں کچھ دیر پہلے فوجیوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ اب وہاں سے ھیانک چیخیں منڈلاتی ہوئی آرہی تھیں۔

وہ بڑی مشکل سے اٹھی پھر ہانپتی کانپتی اور گرتی پڑتی اپنے مکان کے اندر پہنچ گئی۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ مارے دہشت کے برا حال تھا۔ وہ ھڑکتے ہوئے دل سے اپنے بچھڑے ہوئے دوستوں کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر دشمن

پہنچ کر دل دہلا رہے تھے۔ اس نے انتظار کی کھڑکی بھی بند کر دی۔ یہ ملکوں کو فتح کرنے والے اسی طرح بے دردی سے نازک دلوں کی کھڑکیاں بند کر دیتے ہیں۔

وہ بستر پر جا کر اوندھے منہ گر پڑی۔ پھر ایک تکیہ کھینچ کر اسے بھڑکتے ہوئے سینے کے سائے میں دبوچ لیا۔ باہر بم پھٹ رہے تھے اندر سینہ بھی گولوں کی طرح دھمک رہا تھا۔ ایسے وقت کیسی بے یار کی تنہائی ہوتی ہے۔ اگر اس وقت کوئی اپنا ہوتا تو اسے سینے سے لگا کر اپنے بازوؤں میں چھپا کر رکھ لیتا۔ اس کے باپ نے کہا تھا کہ وہ کسی اچھے سے نوجوان کو پسند کر لے مگر اسے کوئی پسند نہیں آیا تھا۔ اس کے چاہنے والے بہت تھے۔ سب ہی اس حسین بیوہ کی جوانی کو دیکھ کر آہیں بھرا کرتے تھے۔ اب تو وہ بھی چاہتی تھی کہ کوئی ہمدم اور تنہائی کا ہمراز مل جائے۔ مگر وہ کیا کرے۔ دل کسی پر مائل نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ایک سہیلی نے چڑ کر کہہ دیا تھا۔

"اس شہر کے اتنے گبھرو جوانوں میں سے کوئی تجھے پسند نہیں آ رہا ہے۔ اب تو تیرے لئے کوئی آسمان سے ہی اترے گا۔"

اور وہ لوگ آسمان سے اتر رہے تھے۔ گولیاں برسا رہے تھے اور بم کے دھماکے کر رہے تھے۔ اسی وقت برآمدے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ زور زور سے پیٹنے کی آواز آئی۔

"الوینہ تم کہاں ہو؟ دروازہ کھولو میں تمہارا باپ ہوں۔"

وہ کمرے سے نکل کر دوڑتی ہوئی بیرونی دروازے کے پاس آئی اور اسے کھول دیا۔ ڈیکن پال نے اندر آ کر دروازے کو دوبارہ بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ تیزی سے چلتا ہوا ایک چھوٹے سے اسٹور روم میں گیا۔ وہاں اس نے ایک نیا سوئچ بورڈ بنا رکھا تھا۔ اس نے اس بورڈ کے تمام سوئچ آن کر دیئے۔ پھر اس نے الوینہ سے کہا۔

"ذرا باہر جھانک کر دیکھو کیا ہماری دکان روشن ہو گئی ہے۔"

الوینہ دوڑتی ہوئی گئی پھر اسی طرح دوڑتی ہوئی واپس آ کر حیرانی سے بولی۔

"پاپا.......... ہمارا جنرل اسٹور تو بالکل سرخ ہو گیا ہے۔ کیا تم نے وہاں سرخ بلب لگائے ہیں؟ ہمارے مکان کے برآمدے کا بلب بھی سرخ ہے۔"

ڈیکن پال نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ "ہاں بیٹی اب تم اطمینان سے جا کر سو جاؤ۔ اب وہ ادھر فائرنگ نہیں کریں گے۔ ہمارے مکان اور جنرل اسٹور کو نقصان

نہیں پہنچائیں گے۔ میں نے حملہ آوروں کو سگنل دے دیا ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیرانی سے اپنے باپ کا منہ تکنے لگی۔ "پاپا یہ جو باہر سے حملہ آور آئے ہیں تم انہیں کیسے جانتے ہو؟ اور وہ تمہارے سرخ سگنل کو کیسے سمجھیں گے؟"

بوڑھے نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے ہنس کر کہا۔ "الوینہ یہ تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ میں ان کا جاسوس ہوں۔"

الوینہ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ "جاسوس؟ نہیں نہیں تم جاسوس نہیں غدار ہو۔ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ تم نے کس طرح یہاں کے فوجیوں کو کاک ٹیل پارٹی دے کر ایک ہی جگہ ریکریشن ہال میں جمع کر دیا تھا تاکہ آسانی سے ان پر غلبہ پایا جا سکے اور تم نے جنرل اسٹور کو بھی بند کر دیا۔ میں خطرے کے سائرن کو آن نہ کر سکی۔"

بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں میں جنرل اسٹور کو بند کرنے کے بعد ناظم اعلیٰ کی کوٹھی میں گیا تھا میں نے وہاں کا سائرن بھی بیکار کر دیا ہے۔ اب وہ جتنی دیر میں سائرن کو درست کریں گے۔ اتنی دیر میں ہمارے حملہ آور دوست اس جزیرے کے چپے چپے پر قبضہ جما لیں گے۔ یہاں والوں کے نظریئے کے مطابق تم مجھے غدار کہہ سکتی ہو مگر وہاں والوں کی وفاداری سے میں بہت بڑا جاسوس یا سیکرٹ ایجنٹ کہلاؤں گا۔"

"میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ تم نے یہاں بیس سال گزارے ہیں۔ میری ماں نے یہاں مجھے جنم دیا۔ مجھے یہاں کی مٹی سے اور یہاں کے لوگوں سے اتنی محبت ہے کہ ان کی خاطر میں تم سے نفرت کر سکتی ہوں۔"

"آہستہ بولو۔ حملہ آور اس طرف آتے ہی ہوں گے۔ اگر انہوں نے تمہاری باتیں سن لیں تو تمہیں شوٹ کر دیں گے۔ تم ابھی بچی ہو۔ یہ نہیں جانتیں کہ حکومت بدلتی ہے تو قانون بھی بدلتا ہے۔ قانون بدلتا ہے تو وفاداری کے اصول بھی بدلتے ہیں یہاں کے مفتوح مجھے غدار کہہ کر میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔ مگر جو فاتح بن کر آ رہے ہیں وہ میرے سینے پر وفاداری کے تمغے سجائیں گے۔ میں اس دنیا کو تم سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ آئندہ میں تمہاری زبان سے باغیانہ باتیں نہیں سننا چاہتا۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی برآمدے میں فوجی بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ اس کے

بعد کسی فوجی کی بھاری بھرکم آواز نے کہا۔

"مسٹر ڈیگن پال آپ پوری طرح محفوظ ہیں۔ لہٰذا اپنی بیٹی کے ساتھ باہر آجائیں۔"

ڈیگن پال نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر باہر آگیا۔ باہر چاندنی میں دور دور تک فوجی جوان مشین گن اور رائفلیں لئے کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں برف میں دھنسے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس مکان کا اور جنرل اسٹور کا چاروں طرف سے محاصرہ کیا ہوا تھا۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے ایک فوجی نے آگے بڑھ کر ڈیگن پال سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں کرنل لارنس ہوں۔ آپ نے ہمارے ساتھ بھرپور تعاون کیا ہے ہم اپنی مشترکہ پلاننگ کے مطابق کامیاب ہوچکے ہیں۔ ریکریشن ہال کے تمام فوجی مارے جاچکے ہیں۔ وہ تعداد میں کل چالیس ہیں۔ آپ کی رپورٹ کے مطابق یہاں کی فوج میں ساٹھ جوان ہیں۔ ان میں سے بیس ہمارے ہاتھ نہیں آئے لیکن صبح تک وہ بھی مارے جائیں گے۔ یا قیدی بنا لئے جائیں گے۔"

اس کی باتوں کے دوران دو فوجی مکان کے اندر جاکر تلاشی لے رہے تھے۔ ڈیگن پال نے جنرل سٹور کو بھی کھول دیا۔ تاکہ کرنل لارنس پوری طرح مطمئن ہوجائے۔ الوینہ چاروں طرف نظریں دوڑا رہی تھی۔ بہت سے فوجی جوان اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ دوست ہوں یا دشمن سبھی اسے ایسی ہی نظروں سے دیکھتے تھے۔ سبھی کی نظریں کہتی تھیں۔ "یہ کیا کر رہی ہو؟ ایسی انمول جوانی کو زنگ لگ جائے گا۔ ذرا عقل سے کام لو اسے کسی کے بازوؤں میں گزارتی جاؤ۔ بہتی جوانی ہو یا بہتی ندی ہو وہ تو سبھی کو سیراب کرتی جاتی ہے۔"

کرنل کے پاس ہی ایک دوسرا آفیسر کھڑا ہوا تھا۔ وہ میجر سلمان تھا۔ اس کی نظریں بھی بار بار الوینہ کی طرف بھٹک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی بھوک تھی مگر ہوس نہیں تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے بارود کے دھماکوں میں شاعری کی کتاب پڑھ رہا ہو۔ وہ کتاب اوپر سے اتنی خوبصورت تھی پتہ نہیں ورق ورق کھلے گی تو کتنے دھڑکتے ہوئے معنی لٹائے گی۔

مکان اور جنرل سٹور کی تلاشی لینے والے فوجیوں نے آکر اطمینان کا اظہار کیا کہ

ہاں کوئی دشمن چھپا ہوا نہیں ہے۔ کرنل لارنس نے کہا۔

"مسٹر ڈیگن اب آپ اپنی بیٹی کو آرام کرنے کے لئے مکان میں چھوڑ دیں۔ ہمارے فوجی یہاں اس کی حفاظت کریں گے۔ آپ یہاں کے ناظم اعلیٰ کی کوٹھی تک کیپٹن بینینک کی رہنمائی کریں۔"

پھر اس نے پلٹ کر کیپٹن بینینک کو مخاطب کیا۔ "کیپٹن تم ناظم اعلیٰ کی کوٹھی کی تلاشی لو۔ اس سے کہو کہ وہ اپنی فیملی کو کسی دوسری جگہ منتقل کردے۔ اب وہاں فوجی دفتر قائم کیا جائے گا۔"

پھر اس نے کیپٹن پریکل کو حکم دیا "کیپٹن .... مسٹر ڈیگن بجلی اور پانی کے محکمے تک تمہاری رہنمائی کریں گے صبح ہونے تک تم اس محکمے کو اپنے کنٹرول میں لے لو اور سارجنٹ تم اناج کے گوداموں کو اپنے کنٹرول میں لوگے۔ تم سب مسٹر ڈیگن کے ساتھ جاؤ۔"

ڈیگن پال حکم کی تعمیل کے لئے آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ دو کیپٹن اور ایک سارجنٹ بھی روانہ ہوگئے۔ ان چاروں کے پیچھے بہت سے فوجی ایک قطار میں مارچ کرتے ہوئے جارہے تھے۔ کرنل لارنس نے الوینہ سے پوچھا۔

"بے بی تمہارا نام کیا ہے؟"

"الوینہ..........." اس نے مختصر جواب دیا۔

"بہت خوبصورت نام ہے۔" میجر سلمان بے اختیار بول پڑا۔ الوینہ کی نظریں اس کی طرف اٹھیں تو میجر کی نظریں جھک گئیں۔ الوینہ کو اس کا یہ انداز بڑا اچھا لگا۔ لوگ تو اس کی تعریف کرتے ہی اس تعریف کے جواب میں اسے حاصل کرنے کے لئے گھورتے رہتے تھے مگر اس نے جھینپ کر نظریں جھکالی تھیں۔ اس طرح کسی کی سوچ کو اور چھپی ہوئی شرافت کو پڑھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ وہ مکان کے اندر جانے لگی تو کرنل نے کہا۔

"الوینہ یہاں تمہیں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ پھر بھی دروازہ اندر سے بند کرلو۔"

دروازہ بند کرتے کرتے بھی اس کی نظریں میجر سلمان کی طرف اٹھ گئیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی مگر دروازہ بند ہونے کے آخری نقطہ پر اسے

دیکھ ہی لیا۔ دروازہ تو بند ہو گیا مگر کھلی آنکھوں میں اس کی آخری جھلک باقی رہ گئی۔ وہ جس کمرے سے گزر رہی تھی وہاں بھی وہ جھلک رہا تھا۔ اپنی خوابگاہ میں پہنچی تو آنکھوں نے وہاں بھی اسے جھلملاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بستر پر گرتے ہی اسے اپنے دماغ سے دھتکار دیا اور اس کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی جہاں سے سمندر کی طرف جانے والا راستہ نظر آتا تھا اس کی سوچ نے پہلی بار تھکے ہوئے انداز میں اسے سمجھایا۔

"بس کر باؤلی۔ اب وہ اس راستے سے کبھی واپس نہیں آئے گا۔ جسے آنا تھا وہ آسمان سے اتر کر آگیا ہے۔ اگر تیرے مُردہ شوہر کی طرح تیرے جذبات بھی مُردہ ہوتے تو تو جی لیتی مگر اب تجھے جینے کا سہارا ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔"

وہ آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر نیند آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ اس کے وطن میں کتنے ہی اجنبی آگئے تھے۔ اجنبی بوٹوں کی بھاری بھرکم آواز ادھر سے ادھر ابھرتی اور ڈوبتی جارہی تھی۔ اگرچہ اسے حملہ آوروں کا تحفظ مل گیا تھا اس کے باوجود وہ ڈر رہی تھی اور ندامت سے سوچ رہی تھی کہ اس کے باپ کی غداری کی وجہ سے یہاں کے لوگ غلام بن گئے ہیں۔ آزادی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت سے محروم ہو کر یہاں کے لوگ اس کے باپ کو کبھی معاف نہیں کریں گے اور اسے اس کی بیٹی سمجھ کر اس سے بھی نفرت کریں گے۔ بچپن سے جوانی تک اتنی محبتیں حاصل کرنے کے بعد کیا وہ ان کی نفرتوں کو برداشت کرسکے گی؟ یہ خیال اس کے دل میں کچوکے لگا رہا تھا۔ اسے اپنے پاپا سے نفرت ہوتی جارہی تھی۔ مگر نفرت کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ خون کا اتنا اہم رشتہ اتنی آسانی سے نہیں کاٹا جاسکتا۔ اس دنیا میں بہت سے پسندیدہ اور ناپسندیدہ رشتوں کو سمیٹ کر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ اب یہی لوگ جو بالکل ہی ناپسندیدہ تھے اس کے چاروں طرف رشتے داروں کی طرح پھیل گئے تھے۔ باہر سے ان کی باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی سی آوازیں آرہی تھیں۔

☆------☆------☆

جنرل سٹور کے ایک کمرے میں کرنل لارنس اور میجر سلمان ایک ٹرانسمیٹر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ کرنل کوڈ ورڈز میں کسی کو موجودہ مہم کی رپورٹ سنا رہا تھا پھر ٹرانسمیٹر آف ہوتے ہی ایک فوجی ان کے لئے کافی کی پیالیاں لے آیا۔ کرنل نے گرما گرم کافی کی ایک چسکی لینے کے بعد کہا۔

"میجر تم نے الوینہ کے نام کی تعریف کی تھی۔"

"جی ہاں۔ میری زبان سے بے اختیار یہ بات نکل گئی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کے سامنے فوجی ڈسپلن کا خیال نہیں رکھا۔"

"میجر میں تم سے شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ اس بات کو میں خوب سمجھتا ہوں کہ جذبات کسی عورت کے لئے ہوں تو وہ بے لگام ہو جاتے ہیں۔ ہم سب پورے ایک برس سے لڑتے چلے آرہے ہیں۔ پورے ایک برس سے ہم نے اپنی بیویوں اور اپنی محبوباؤں کی صورت نہیں دیکھی۔ اتنی طویل مسلسل جنگ کے دوران سپاہیوں کو کھانا مل جاتا ہے عورت نہیں ملتی۔ تم نے بے اختیار الوینہ کی تعریف کی تھی اور وہ اس لئے کہ جذبات کسی ڈسپن کو نہیں مانتے جذبات میں انتشار ہوتا ہے ڈسپلن نہیں ہوتا۔"

میجر سلمان نے تائید میں سر ہلایا۔ "آپ درست کہتے ہیں۔ میں نے اپنی رجمنٹ کے سپاہیوں کو سختی سے تاکید کی ہے کہ وہ اس شہر کو فتح کرنے کے بعد یہاں کے کسی گھر کا کھانا نہ کھائیں اور پانی نہ پئیں کیونکہ ابھی یہ لوگ اندر ہی اندر لاوے کی طرح پک رہے ہوں گے۔ میں نے یہ بھی اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ یہاں کسی عورت کے قریب نہ جائیں۔ جس ملک کے سپاہی مجبور ہو کر ہتھیار پھینک دیتے ہیں وہاں کی عورتیں اپنی اداؤں کے ہتھیاروں سے ہاری ہوئی بازی جیتنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مرد سرحدوں پر لڑتے ہیں اور عورتیں شہروں میں مورچے بناتی ہیں۔ لہٰذا ان سے دو ہاتھ دور ہی رہنا چاہئے۔"

"گڈ.......... الوینہ بھی اسی زمین کی پیداوار ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھے ہیں۔ شاید وہ ہمیں پسند نہیں کرتی ہے میں امید کرتا ہوں میجر کہ تم بھی الوینہ سے دو ہاتھ دور رہو گے۔"

میجر سلمان کے چہرے پر سے مایوسی کا ایک سایہ سا گزر گیا۔ اس نے مُردہ دلی سے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا۔ الوینہ جیسی کم عمر لڑکیاں اپنے حسن اور جوانی کا چارہ ڈال کر مجھے بیوقوف نہیں بنا سکیں گی۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔"

بے شک اس نے دنیا دیکھی تھی مگر پورے ایک برس سے عورت نہیں دیکھی تھی۔ دیکھی بھی تھی تو الوینہ جیسی نہیں دیکھی تھی۔ جب وہ برآمدے میں اس کے

قریب کھڑی ہوئی تھی تو اتنی برف باری کے باجود اس کے بدن کی آنچ اس تک پہنچ رہی تھی۔ یعنی وہ ایسی تھی کہ موسم کو بدل دیتی تھی۔ اس نے کافی کے گرم پیالے کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کے وجود کا تصور کیا مگر پیالے میں اتنی گرمی نہیں تھی۔

☆------☆------☆

الوینہ نے بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے کئی بار برآمدے کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو دیکھا۔ وہ کھڑکی بند تھی مگر شیشوں کے اس پار پہرہ دینے والے فوجی کبھی کبھی نظر آجاتے تھے۔ پتہ نہیں وہ پہرہ دے رہے تھے یا جان بُوجھ کر برآمدے میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ جو کچھ بھی ہو مگر وہ کھڑکی کے پاس آکر ذرا دیر کے لئے رک جاتے تھے اور شیشے کے پار بستر پر سلگتے ہوئے شباب کو دیکھتے تھے پھر حسرت بھری نظریں پھیر کے چلے جاتے تھے۔ الوینہ پہلے دو چار بار طرح دے گئی پھر اس نے جھنجلا کر بتی بجھا دی۔

خواب گاہ میں بلیک آؤٹ ہوگیا۔ اب وہ کسی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ اسے برآمدے میں فوجی بوٹوں کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی وہ مطمئن ہوگئی کہ اب آرام سے سوسکے گی۔ مگر وہ بھول گئی تھی کہ حسن پردے میں چھپ کر اور زیادہ للچاتا ہے۔ اب اس اندھیرے میں کبھی کبھی دھیمی دھیمی دستک کی آواز سنائی دیتی تھی۔ باہر کھڑکی کے پاس سے گزرنے والے ذرا رک کر شیشے پر اپنی انگلی بجاتے تھے۔ وہ آوازیں سن کر اس کی نیند اڑ جاتی تھی۔ اس کے باپ نے ایک آزاد جزیرے میں دشمنوں کو بلایا تھا۔ یہاں کے پُرامن شہریوں کی آزادی چھین لی تھی۔ یہاں کا دانہ پانی چھین کر غیروں کے حوالے کردیا تھا مگر اپنے سینے پر وفاداری کے تمغے سجانے کا خواب دیکھتے وقت وہ بھول گیا تھا کہ جب باہر کی فوج فاتح بن کر آتی ہے تو صرف پیٹ کی بھوک نہیں مٹاتی۔ وہ فوجی اس کی بیٹی کو بھی بھوکی نظروں سے دیکھ سکتے تھے۔ بلکہ اب دیکھ رہے تھے۔ اس کے پاپا نے ابھی یہ نہیں دیکھا تھا کہ اس تاریکی میں چھاتہ بردار فوجیں اس کی بیٹی کے بستر پر اتر رہی ہیں۔

دوسری صبح شہر میں عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ناظم اعلیٰ کی کوٹھی کے سامنے فاتح فوجی بینڈ بجارہے تھے اور اپنا پرچم لہرا رہے تھے۔ کوٹھی کے اندر ناظم اعلیٰ عشام جعفری' ناظم اور بیلے کرونا' جگجیت اور فادر بنجامن ایک قطار میں کرسیوں پر

بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے ایک بڑی سی میز کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر کرنل لارنس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس لیفٹیننٹ مارک کھڑا ہوا تھا۔ دوسرے فوجی دروازے اور کھڑکیوں کے پاس مستعد نظر آرہے تھے۔ کرنل لارنس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہا۔

"آپ چاروں یہاں کے سربراہ تھے مگر اب نہیں ہیں۔ یہاں کے لوگوں نے اپنی حفاظت سلامتی اور خوشحالی کے لئے آپ لوگوں کو اپنا سربراہ منتخب کیا تھا۔ اب ان کی خوشحالی اسی میں ہے کہ وہ ہمارے ساتھ پُرامن رہیں۔ آپ چاروں کا فرض ہے کہ آپ ہمارے فوجیوں کے ساتھ شہر میں جاکر لوگوں کو سمجھائیں کہ ان کی حکومت اور ان کی تقدیریں بدل گئی ہیں۔ اگر وہ امن وامان سے رہیں گے تو کسی کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔"

عشام جعفری نے جواب دیا۔ "یہاں کے باشندے ہمیشہ آزاد رہے ہیں۔ وہ غلامی قبول نہیں کریں گے اگر ہم انہیں سمجھانے جائیں گے تو ہمیں ذلت کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ ہم اپنے لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہونے کے بجائے عزت سے مرجانا پسند کریں گے۔"

بیلے کرونا نے کہا۔ "یہاں کے لوگوں نے جس اعتماد سے ہمیں اپنا بڑا بنایا ہے ہم اس اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائیں گے۔"

جگجیت نے جواب دیا۔ "اتنی بڑی دنیا کے نقشے پر یہ ایک مثالی دھرتی ہے جہاں سب بھائی بھائی کی طرح گلے مل کر رہتے ہیں ہم ان کا گلا نہیں کاٹیں گے۔"

فادر بنجامن نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔ "او گاڈ۔ ہیلپ آس.......... تیرے بندے ایک بار پھر صلیب پر چڑھنے والے ہیں اور ہم آزادی کی خاطر صلیب پر ضرور چڑھیں گے۔"

کرنل نے غصے سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "تم سب کو شوٹ کردیا جائے گا۔"

عشام جعفری نے کہا۔ "ہماری موت کی خبر پھیلے گی تو پھر تم بغاوت کو نہیں کچل سکو گے۔"

اتنے میں ایک فوجی نے کمرے میں آکر سلیوٹ کیا اور کہا۔ "جناب..........

سارجنٹ ہری رام مارا گیا ہے۔ ہمیں اناج کے گودام کے پاس اس کی لاش ملی ہے۔"

"کس نے اسے قتل کیا ہے؟" کرنل نے غصے سے اٹھ کر کہا۔ "اسے تلاش کرو اور اس کے پورے خاندان کو گولی سے اُڑا دو۔"

بیلے کرونا نے کہا۔ "کرنل تم نے یہاں تباہی مچا دی۔ ہمارے تمام فوجیوں کو مار ڈالا۔ ابھی تو تمہارا ایک سپاہی مارا گیا ہے تو تم مارنے والے کو قاتل کہہ رہے ہو۔ تمہارے جیسے قاتلوں اور غاصبوں کو کون سزا دے گا؟"

"جنگ میں جس کا پلہ بھاری ہوتا ہے وہی سزا دیتا ہے۔"

"ہم نے جنگ نہیں کی ہے کرنل' بلکہ ہم پر جنگ مسلط کی جا رہی ہے۔"

"میں بحث نہیں کرنا چاہتا۔ تم لوگوں کو پھر ایک بار سمجھاتا ہوں کہ شہر میں جا کر اپنے آدمیوں کو سمجھاؤ۔ جب تک تم لوگ میرے حکم کی تعمیل نہیں کرو گے۔ اس وقت تک اسی کوٹھی میں نظربند رہو گے۔"

اس نے اپنے دو فوجیوں کو حکم دیا کہ انہیں کمرے میں لے جا کر بند کر دیا جائے۔ جب وہ چاروں جانے لگے تو کرنل نے فادر بنجامن کو روک لیا پھر ان کے جانے کے بعد کہا۔

"فادر! میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں اس لئے کہ میں بھی عیسائی ہوں اور آپ ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔ آپ چاہیں تو اکیلے یہاں حکومت کر سکتے ہیں اور عیسائیت کو پھیلا سکتے ہیں۔ ہندوؤں مسلمانوں اور پرتگالیوں کے ساتھ رہ کر آپ آٹے میں نمک کے برابر نظر آتے ہیں۔"

فادر نے جواب دیا۔ "آٹے میں نمک نہ ہو تو روٹی بے مزہ ہو جاتی ہے۔ آپ ہمیں نمک ہی رہنے دیں تاریخ نے ہمیں سکھا دیا ہے کہ کس طرح باہر سے آنے والے لوگ ہمارے درمیان نفرت اور عداوتوں کا بیج بوتے ہیں۔ میں عشام جعفری کی قیادت میں مر سکتا ہوں مگر تمہاری پالیسی کے مطابق زندہ نہیں رہ سکتا۔"

کرنل نے اسے اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش کی پھر مایوس ہو کر اسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے عشام جعفری کو بلایا۔

"مسٹر عشام ابھی فادر سے میری بات ہوئی تھی۔ وہ اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ وہ شہر میں جا کر اپنے لوگوں کو سمجھائیں گے۔ اگر تم نے اپنے مسلمان بھائیوں کو

سمجھانے سے انکار کیا تو تم اور تمہارے بھائی اپنی ضد کی وجہ سے دوسروں سے کٹ کر رہ جائیں گے۔ فادر کو یہاں اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ ہمارے پاس فوجی قوت ہے ہم ان کی سرپرستی کریں گے۔ اگر تم بھی میری بات مان جاؤ تو اس میں تمہاری اور تمہاری قوم کی بھلائی ہے۔"

عشام جعفری نے جواب میں کہا۔ "میری قوم کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ آزادی کی خاطر مر جائیں۔ میں فادر بنجامن کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ مجھ سے سیاسی چالیں نہ چلو۔"

کرنل نے مایوس ہو کر اسے بھی دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔ اس کے بعد اس نے بیلے کرونا اور جگ جیت کو باری باری بلایا۔ انہوں نے بھی وہی دو ٹوک فیصلہ سنایا کہ مر جائیں گے مگر غلامی قبول نہیں کریں گے۔ کرنل گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس جزیرے کے وہ چاروں بڑے اس کے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ اگر وہ انہیں موت کی سزا دیتا تو وہاں کے عوام اپنے سربراہوں کی خاطر جان دینے کے لئے سڑکوں پر نکل آتے۔ ابھی نرمی سے اور سیاسی مہربانیوں سے کام نکالنا تھا۔ وہ جزیرہ فوجی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھا۔ ایسے وقت جبکہ بڑے بڑے ممالک میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے تو جزیرے میں ابھرنے والی بغاوت دشمن فوجوں کو ادھر آنے میں آسانیاں فراہم کر دیتی۔ لہٰذا انہیں بہت خاموشی سے کچلنا تھا بڑی مصلحت سے کام لینا تھا۔

☆------☆------☆

الوینہ صبح ہوتے ہی گھر سے نکل گئی تھی۔ کیونکہ برآمدے میں پہرہ دینے والے فوجیوں سے وحشت ہو رہی تھی۔ جب وہ سڑکوں اور گلیوں سے گزرنے لگی تو وہاں بھی فوجی گشت کرتے نظر آئے۔ شہر کے لوگ بہت کم بازار میں دکھائی دے رہے تھے۔ مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے گھر میں قید رہنے کے بجائے اپنی کسی سہیلی کے یہاں وقت گزارنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی ایک سہیلی کے دروازے پر دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا لیکن اس سے پہلے کہ وہ اندر جاتی اس کی بچپن کی سہیلی نے نفرت سے اونہہ کہہ کر دروازے کو دوبارہ بند کر دیا۔

دروازہ بند ہونے کی زوردار آواز ایسی تھی جیسے منہ پر تھپڑ لگا ہو۔ وہ پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ باپ کی غداری کی سزا اسے بھی ضرور ملے گی۔ اس نے دوبارہ

دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا:

"سکینہ دروازہ کھولو۔ میں تمہاری غلط فہمی دور کرنا چاہتی ہوں۔"

اندر سے سکینہ کے باپ کی آواز سنائی دی۔

"پہلے جاکر اپنے باپ کی غلط فہمی دور کرو۔ وہ یہودی کا بچہ ہماری آزادی نہیں چھین سکے گا۔ اگر تم اپنے دامن میں لگے ہوئے دھبے کو دھونا چاہتی ہو تو جاؤ اپنے باپ کا سر کاٹ کر لادو۔"

کیا وہ اپنے باپ کی دشمن بن سکتی ہے؟ اس خیال سے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اپنے باپ کو پسند نہیں کرتی تھی مگر پسند نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کی جان کی دشمن بن جائے۔ وہ دل برداشتہ ہو کر آگے بڑھ گئی۔ راستے میں کچھ نوجوان نظر آئے۔ یہ وہی نوجوان تھے جو الوینہ جیسی حسین دوشیزہ کو اپنے دلوں میں بٹھا کر پوجتے تھے جب وہ قریب سے گزرتی تو اسے بڑے پیار اور حسرت بھری نظروں سے دیکھتے رہتے تھے مگر اس وقت ان کی بھی نظریں بدل گئی تھیں۔ کسی نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ کسی نے اس کے راستے پر تھوک دیا۔

آہ۔ جو ہر دل کے ترازو میں تولی جاتی تھی ہر رات کے سپنے میں دیکھی جاتی تھی اور ہر آرزو کی ابتدا میں جس کا نام آتا تھا' اب اس کے نام پر تھوکا جا رہا تھا۔ وہ اپنی توہین برداشت نہ کر سکی۔ اک دم سے پلٹ کر اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگی۔ جب لوگ اس سے محبت کا اظہار کرتے تھے اور اس کے پاس شادی کے پیغامات بھیجتے تھے تو وہ محبت کرنے والوں سے بے نیاز ہو کر اپنے مُردہ شوہر کے انتظار میں وقت ضائع کر رہی تھی۔ اب وہ محبت کی تلاش میں نکلی تھی تو محبت کے بازار میں کوئی اس کا خریدار نہ تھا۔ اس کے آس پاس صرف للچانے والے فوجی رہ گئے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے گھر کے برآمدے میں آگئی۔ اسے پریشان حال دیکھ کر ایک فوجی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ہیلو سوئٹی.......... کیا میں تمہارے کام آسکتا ہوں؟"

"یو شٹ اپ!" وہ چیختی ہوئی مکان کے اندر داخل ہوئی اور دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ پھر وہ بھاگتی ہوئی اپنے بستر پر آکر اوندھے منہ گر پڑی۔ اس شہر کے جتنے بچے جوان اور بوڑھے تھے وہ سب اس کے اپنے تھے۔ آج اپنوں نے جیسے اسے کتیا

سمجھ کر دھتکار دیا تھا۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔

پتہ نہیں وہ کتنی دیر تک روتی رہتی۔ اچانک ہی دروازے پر دستک سن کر اک دم سے چپ ہو گئی۔ اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ بے اختیار چیخ چیخ کر روئے جا رہی تھی۔ دروازے پر کون ہو سکتا تھا۔ اس شہر کا کوئی بچہ بھی اس کے دروازے پر آنا پسند نہ کرتا۔ کوئی فوجی ہی ہو سکتا تھا۔ وہ جھنجلا کر خواب گاہ سے باہر آئی۔ اس نے بیرونی دروازے کے پاس کھڑے ہو کر نفرت سے پوچھا۔

"باہر کون ہے کیوں مجھے پریشان کیا جا رہا ہے؟"

"سوری بے بی........... میں میجر سلمان ہوں۔ اگر میرے کسی آدمی نے تمہیں پریشان کیا ہے تو مجھے بتاؤ..........."

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر کہا۔ "تم سب نے مل کر پریشان کیا ہے۔ تم کیوں آئے ہو میری زمین پر؟ کب جاؤ گے یہاں سے.......... بتاؤ کب پیچھا چھوڑو گے؟"

میجر خاموشی سے اس کا منہ تکنے لگا۔ پھر اس نے نرمی سے کہا۔ "تم بہت پریشان ہو۔ تمہاری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ ایک برس پہلے جب میں محاذ پر جانے کے لئے گھر سے نکل رہا تھا تو میں نے اپنی بیوی کی آنکھوں میں یہی آنسو دیکھے تھے۔ میں نے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔ وہ روتی ہوئی بولی تھی۔

"میرے سرتاج تمہارے جانے کے بعد بھی یہ آنکھیں روتی رہیں گی۔ پھر کون میرے آنسو پونچھے گا؟"

میں نے جواب دیا تھا۔ "میں واپس آکر پونچھ دوں گا۔ ہم اپنوں کو جھوٹی تسلیاں دیتے ہیں۔ سپاہی یا تو لام سے واپس نہیں آتے یا پھر اس کے بچھڑے ہوئے اس سے نہیں ملتے۔ دو ماہ بعد مجھے ایک خط ملا کہ میری بیوی ہسپتال میں انتظار کرتے کرتے مر گئی ہے۔ وہ اس انتظار میں روتے روتے مر گئی کہ میں وہاں آکر اس کے آنسو نہ پونچھ سکا۔ الوینہ' کیا تمہیں کوئی روتا چھوڑ گیا ہے؟ کیا تم بھی آنسو پونچھنے والی انگلیوں کا انتظار کر رہی ہو؟"

اس کی باتوں میں عجیب سی اداسی تھی۔ الوینہ سحر زدہ سی ہو کر اس کا منہ تکتی رہ گئی' اس کے آنسو پونچھنے والا سمندر کی گود سے واپس نہیں آئے گا مگر پتہ چلا کہ

سمندر پار سے آنے والا میجر بھی اس کی طرح زخمی ہے۔ الوینہ نے دیکھا میجر کے ہاتھ کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ان انگلیوں کو وہ آنسو پکار رہے تھے جنہیں وہ پونچھ نہ سکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لرزتی ہوئی انگلیاں آگے بڑھیں اور الوینہ کے آنسوؤں پر آکر ٹھہر گئیں۔

اس وقت الوینہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آزادی چھیننے والی انگلیوں سے نفرت کیوں نہیں کر رہی ہے۔ مگر دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس کی ظالم انگلیاں بھی زخمی ہیں۔ وہ ایک شریکِ حیات کے آنسوؤں تک نہ پہنچ سکیں۔ ہمدردی کا کوئی جذبہ تھا یا محبت کی کوئی تاثیر تھی کہ وہ اپنے آنسو پیش کر رہی تھی۔

پھر وہ اچانک ہی دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور چونک کر میجر سلمان کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ یہ چند لمحات کیسے تھے؟ میجر اس کے قریب کیسے آگیا۔ وہ اس کی قربت سے انکار کیوں نہ کر سکی؟ وہ پاؤں پٹخ کر تلخ لہجے میں بولی۔

"تم میری اجازت کے بغیر اندر کیسے آگئے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔"

"کسی کے آنسو پونچھنے کے لئے یا کسی کے زخم پر مرہم رکھنے کے لئے قریب آنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے لئے اجازت حاصل کرنا ضروری نہیں ہے۔"

"تم.......... تم گولیاں چلاتے وقت انسانی زندگیوں سے کھیلتے ہو پھر انہیں زخمی کرنے کے بعد ان پر مرہم رکھتے ہو۔ پھر مسیحائی کا دعویٰ کرتے ہو.......... گیٹ آؤٹ۔"

"تم غصے میں ہو.........." میجر نے بڑی نرمی سے کہا۔ "ذرا سہولت سے باتیں کرو، فوجی تو لڑنے کے لئے ہوتے ہیں۔ میں لڑتا ہوا یہاں تک آیا ہوں۔ تم یقین کرو اگر میں دوسروں کے لئے لڑ سکتا ہوں تو تم اتنی اچھی ہو کہ تمہارے لئے مر بھی سکتا ہوں۔" وہ بے خودی میں بول رہا تھا۔

وہ اک دم سے چونک کر اس کا منہ تکنے لگی۔ ابھی وہ کتنی ساری نفرتوں سے گزر کر آئی تھی۔ اب اسے پھر محبت کے مدھ بھرے بول سنائی دے رہے تھے۔ کوئی اب بھی اس پر جان دینے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ وہ دھوپ میں دوڑتے دوڑتے دراز قد میجر کے سائے میں آکر کھڑی ہوگئی۔ وہ دو قدم دور تھا مگر ایک تناور درخت کی طرح اس پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"تمہیں کس بات کا غصہ ہے؟ یہ بھی بتا دو کہ مجھ سے نفرت کیوں کرتی ہو۔"

اسے پھر غصہ آگیا۔ وہ پھر بولی۔ "کیا تم بچے ہو کیا تم نہیں سمجھتے ہو؟ تمہاری بیوی کے آنسو تم سے چھن گئے تو تمہیں کتنا دکھ ہوا۔ تم مرد ہو تمہاری آنکھ سے آنسو نہیں نکلے مگر تمہارا دل تو روتا ہے۔"

"ہاں میرا دل روتا ہے۔ میں سپاہی ہوں مجھ سے بھی کچھ چھین لیا جائے تو مجھے صدمہ پہنچتا ہے۔"

"تو تم نے ہم سب سے ہماری آزادی کیوں چھین لی؟ یہاں تمہیں کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آتی ہے؟ نہیں.......... ان مسکراہٹوں کے قاتل تم ہو۔"

اس نے قدرے ندامت سے کہا۔ "جیسا کہ میں نے کہا ہے میں ایک سپاہی ہوں۔ تو یہ بھی کہنے دو کہ میں ایک انسان بھی ہوں۔ انسان کے ہونٹوں سے مسکراہٹیں چھینتے وقت مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں ظلم کر رہا ہوں مگر ہر ملک کی فوجیں اس ظلم کو جائز سمجھتی ہیں۔ میں نے ایک بار کرنل سے کہا تھا کہ اس جزیرے پر قبضہ نہ کیا جائے۔ یہاں ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ اتفاق اور میل محبت سے رہتے ہیں۔ کرنل نے جواب دیا تھا کہ ہماری فوج میں بھی ہر قوم اور ہر مذہب کے سپاہی ہیں۔ میں میجر سلمان ہوں۔ وہ کرنل لارنس ہے۔ ایک سارجنٹ ہری رام تھا جس کی لاش آج اناج کے گودام کے پاس پائی گئی ہے۔ اسی طرح اس فوج میں بھی کتنے ہی مذہب کے سپاہی میل محبت سے رہتے ہیں اور شانہ بہ شانہ لڑتے ہیں۔ اس وقت میں کرنل کے جواب پر خاموش ہو گیا تھا۔"

الوینہ نے کہا۔ "ہم یہاں محبت سے رہتے ہیں۔ اگر تم بارود کے بجائے گلدستے لاتے تو ہم محبت سے خوش آمدید کہتے مگر اب ہم تم لوگوں سے نفرت کرتے رہیں گے۔ اگر ہماری محبت چاہتے ہو تو ہماری زمین چھوڑ دو۔"

"میں تمہاری محبت چاہتا ہوں۔"

الوینہ اندر سے لرز گئی وہ سارے جزیرے والوں کی طرف سے محبت کی بات کر رہی تھی اور غاصب بن کر آئے والا میجر صرف اس کی محبت مانگ رہا تھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

"تت.......... تم مجھ سے محبت کرو گے؟"

"ہاں۔ ہمیشہ کروں گا۔" وہ مستحکم لہجے میں بولا۔

"ہر قیمت پر کرو گے؟" اس کی آنکھوں میں سوال سلگ رہا تھا۔

"الوینہ زندگی بہت قیمتی ہوتی ہے کہو تو اس کی قیمت چکا دوں۔"

"محبت میں عورت زندگی نہیں لیتی زندگی دیتی ہے۔ مگر میں اتنی جلدی تمہارے کسی فیصلے کو تسلیم نہیں کر سکتی کیونکہ تم جذباتی انداز میں محبت کا دعویٰ کر رہے ہو۔"

"اللہ کی قسم میں اس وقت جذباتی نہیں ہوں۔ پوری حاضر دماغی سے سمجھ رہا ہوں اور مکمل ہوشمندی سے تمہارے پیار کی آرزو کر رہا ہوں۔"

"کیا تم نے مکمل ہوشمندی سے سوچا ہے کہ مجھ سے محبت کرنے کے لئے میری آزادی سے بھی محبت کرنی ہوگی اور میری آزادی سے محبت کرنے کا مطلب یہی ہوگا کہ تم اپنی فوج سے بغاوت کرو گے۔"

محبت کا مطالبہ کرنے والا چہرہ مرجھا گیا۔ میجر کی سمجھ میں آ گیا کہ جو حسینہ دل میں سما گئی ہے۔ اب اس حسینہ کے دل میں سمانے کے لئے واقعی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ واقعی وہ جذباتی انداز میں سوچ رہا تھا۔ کیا وہ اس کے لئے اپنے سینے پر سجے ہوئے تمغے نوچ کر پھینک سکتا ہے؟ جس مشین گن سے گولیاں چلاتا ہوا اس ضدی حسینہ تک پہنچا ہے کیا اس کی خاطر اپنی ہی فوج کی طرف اس مشین گن کا رخ پھیر سکتا ہے۔ نہیں اس طرح ایک سپاہی کی وفاداری پر حرف آئے گا۔ لڑکیاں تو گلی کوچوں میں مل جاتی ہیں مگر وفاداری کے تمغے بڑی جانبازی کے بعد حاصل ہوتے ہیں۔

"میجر تمہارا جھکا ہوا سر بتا رہا ہے کہ میری محبت مہنگی پڑے گی.......... چلے جاؤ یہاں سے۔"

میجر سلمان نے سر اٹھا کر اسے بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ دو ملکوں کو فتح کرنے والا زمینوں پر جبراً قابض ہونے والا اس وقت جبراً الوینہ کو بھی حاصل کر سکتا تھا۔ الوینہ تو اسے مل جاتی مگر محبت اسے کبھی نہ ملتی۔ بعض اوقات انسان دوسروں سے بہت کچھ چھینتے چھینتے تھک جاتا ہے۔ ایسی تھکن کے بعد عورت کے سامنے پہنچ کر اس سے بڑے پیار سے کچھ مانگنے کو جی چاہتا ہے۔

وہ میجر ایک دوسرے کو سمجھنے والی محبت اور آنسو پونچھنے والی محبت اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے والی محبت کا متمنی تھا مگر ایسی محبت کے لئے بڑے آزمائشی مرحلے سے

گزرنا تھا۔ وہ سر جھکا کر سوچتا ہوا دروازے سے باہر چلا گیا۔ وہاں سے اس نے پلٹ کر بڑی حسرت سے الوینہ کو دیکھا تو اس نے اونہہ کہہ کر ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔

☆======☆======☆

شام تک ساری بستی میں یہ خبر پھیل گئی کہ فاتح فوج کے دو سپاہی مارے گئے ہیں جس گلی میں وہ مُردہ پڑے تھے اس گلی کے تمام جوان اور بوڑھوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور انہیں اذیتیں دے کر پوچھا جا رہا تھا کہ قاتل کون ہے۔ قاتل کا نام نہ بتانے کی صورت میں ان سب کو مار ڈالنے کی دھمکی دی جا رہی تھی مگر وہ اذیتیں برداشت کرنے والے بہت ہی سخت جان تھے۔ وہ کبھی بے ہوش ہو جاتے تھے اور کبھی ان کی حالت مُردوں کی سی ہو جاتی تھی لیکن جب بھی وہ بولنے کے قابل ہوتے تو یہی بولتے کہ تم جیسے درندوں کو مارنے والا ہماری نظروں میں قاتل نہیں ہے ابھی تم ہمیں مار ڈالو مگر تم بھی ایک ایک کر کے مرتے جاؤ گے۔

اس گلی سے گرفتار ہونے والوں میں سات نوجوان اور تین بوڑھے تھے۔ آخر ان سب کو ایک قطار میں کھڑے کر کے شوٹ کر دیا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دھمکی آمیز اعلان کیا کہ ان کا ایک فوجی مارا جائے گا تو اس کے بدلے پانچ گھروں کے آدمی مارے جائیں گے۔

بیلے کروتا نے کہا۔ "کرنل اس جزیرے میں تین ہزار کی آبادی ہے اور تمہارے فوجی بمشکل تمام ڈیڑھ سو ہیں۔ تم اپنے ایک کے بدلے ہمارے پانچ مارو گے تب بھی یہاں نیست و نابود ہو کر رہ جاؤ گے۔"

کرنل نے فاتحانہ انداز میں مسکرا کر کہا۔ "یہاں تمہارے لوگ نہتے ہیں۔ گولہ بارود ہمارے پاس ہے۔ اناج کے گودام پر ہمارا قبضہ ہے۔ اب اناج اور پانی کی سپلائی بند کر دی گئی ہے جب یہ لوگ بھوکے پیاسے مریں گے تو خود ہی ہمارے قدموں میں جھکنے چلے آئیں گے۔"

عشام جعفری جواب میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہمارے نوجوان بھوکے پیاسے رہ کر بھی تمہارا مقابلہ کریں گے۔ مگر اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ اس نے چشم تصور میں دیکھا کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھوک سے نڈھال پڑے ہیں۔ پانی کے ایک

ایک قطرے کے لئے ترس رہے ہیں۔ تب اس نے سوچا کہ نوجوان تو کسی طرح بھوکے پیاسے لڑلیں گے مگر بوڑھوں اور بچوں کا کیا ہوگا۔ وہ بڑی پریشانی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

باہر رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ دور دور تک ویرانی نظر آرہی تھی دو روز پہلے وہ ایک اچھا ہنستا بستا شہر تھا۔ اب شہرِ خموشاں بن گیا تھا۔ مسلح فوجی سڑکوں پر گشت کرتے رہتے تھے۔ جب سے دو فوجی مارے گئے تھے تب سے وہ اکیلے گشت پر نہیں نکلتے تھے تین تین چار چار کی ٹولیوں میں جمع ہو کر آس پاس کے مکانات کی کھڑکیوں اور دروازوں کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے گزرتے رہتے تھے۔ بازار کے پاس ایک گلی میں چار مکانوں کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان روشن کھڑکیوں سے دو چار حسینائیں جھانک رہی تھیں۔

وہ کسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ برف باری میں دور سے آنے والے کچھ فوجی نظر آرہے تھے۔ سڑکوں پر برف جمی ہوئی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے جارہے تھے۔ روشن کھڑکیوں کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے۔ ایک نے للکار کر کہا۔

"یہ کھڑکیاں کیوں کھلی ہوئی ہیں؟ انہیں بند کر دو۔"

پہلی کھڑکی سے ایک عورت نے جھانک کر کہا۔ "میں بہت بھوکی ہوں۔ میرا بچہ بھی بھوک سے بلک رہا ہے۔ تمہارے پاس کچھ کھانے کے لئے ہو تو مجھے دو۔"

ایک عورت کی آواز سن کر فوجیوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ وہ سب ایک دوسرے کی ضرورت کو سمجھتے تھے اور وہ عورت بھی ضرورت مند تھی۔ انہیں سوچنے سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ وہ سب ایک ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ آگے ایک اور کھڑکی سے نسوانی آواز سنائی دی۔ وہاں سے ایک نوجوان لڑکی کہہ رہی تھی۔

"میں بھی بھوکی ہوں۔ مجھے بھی کچھ کھانے کے لئے دو۔"

دو فوجی نوجوان دوسری کھڑکی کی طرف بڑھ گئے۔ اس کے بعد تیسری اور چوتھی کھڑکیوں سے بھی یہی صدائیں گونجیں۔ راشن اور پانی کی سپلائی بند ہو چکی تھی۔ پورے اڑتالیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ کتنے ہی گھروں میں فاقے ہو رہے تھے۔ وہ فوجی

ایک ایک کر کے تمام کھڑکیوں کے سامنے پہنچ گئے اور اپنے اطمینان کے لئے سوالات کرنے لگے۔

"تمہارے گھر میں اور کون ہے؟"

"کوئی نہیں ہے۔ تم لوگوں نے ہمارے آدمیوں کو مار ڈالا ہے۔ اب ہمیں تو نہ مارو۔ کچھ کھانے کے لئے دے دو۔"

"ہم بھی بھوکے ہیں۔ روٹی اس شرط پر ملے گی کہ ہم ایک دوسرے کی بھوک مٹائیں گے۔"

"ہمیں ہر شرط منظور ہے.......... اندر آجاؤ۔"

چار کھڑکیاں بند ہو گئیں۔ چار دروازے کھل گئے۔ چار فوجی اندر چلے گئے۔ پھر انہیں کسی نے باہر آتے نہیں دیکھا۔ دوسری طرف ایک شاہراہ پر پانچ فوجی اپنے ہاتھوں میں اسٹین گن لئے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کرتے جارہے تھے۔ سڑک کے کنارے دیواروں پر برف کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ چلتے وقت دونوں طرف دیکھتے جارہے تھے۔ چاند کی روشنی میں دور تک انہیں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر قریب ہی جو برف کی جو تہیں جمی ہوئی تھیں ان میں اچانک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ برف کے ذرات دور تک فضا میں بکھر گئے۔ پھر ان میں چھپے ہوئے کتنے ہی لوگ اک دم سے فوجیوں پر پل پڑے۔ انہیں اپنے ہتھیاروں کو استعمال کرنے کی مہلت تک نہ ملی ذرا دیر کی جدوجہد کے بعد نہتے شہریوں نے ان کے ہتھیار چھین لئے۔ پانی کی بوتلوں اور کھانے کی چیزوں پر قبضہ کرلیا۔ پھر انہیں مار کر وہیں برف میں دفن کر دیا۔

اندھیری رات میں بڑی خاموشی سے آزادی کے لئے اور اپنی بقا کے لئے لوگ چھپ چھپ کر حملے کر رہے تھے اور ہتھیار جمع کر رہے تھے۔ الوینہ کی خوابگاہ میں کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز پر کھانے کی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں مگر اس نے کھانے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ پھر اس کھڑکی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ جہاں سے سمندر کی طرف جانے والا راستہ نظر آتا تھا مگر اب اس راستے سے میجر سلمان آتا دکھائی دیتا تھا۔ اس نے کئی بار سر کو جھٹک کر اپنے مردہ شوہر کا تصور کیا۔ مگر تصور بگڑ جاتا تھا اور میجر کی تصویر سامنے آجاتی تھی۔ کبھی اس کی انگلیاں بھیگی آنکھوں کی دہلیز پر آکر دستک دیتی تھیں۔

"الوینہ تم آنسو بہاؤ میں پونچھتا ہوں۔"

"اونہہ..........." وہ نفرت سے بڑبڑانے لگی۔ "بزدل کہیں کا یہ نہیں جانتا کہ بستیوں پر جبراً حکومت کرنا دلیری نہیں ہے۔ جب کسی کے دل پر حکومت کرنے کی بات آتی ہے تو ایسے لوگ بزدل بن جاتے ہیں۔"

وہ نفرت کر رہی تھی مگر اسی کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

اس سنگدل میجر نے اس کے آنسوؤں کو چھو کر اس کے دل کو چھو لیا تھا۔ اسی لئے رات گزر رہی تھی اور آنکھ جاگ رہی تھی۔ اب یہ آنکھیں اس کا انتظار کر رہی تھیں کہ اس میں عشق کا جذبہ سلامت ہوگا تو وہ کچے دھاگے سے بندھا چلا آئے گا۔

پہلے فوجی افسروں نے مکان کے پاس ہی جنرل اسٹور میں رہائش اختیار کرلی تھی۔ اب انہوں نے ناظم اعلیٰ کی کوٹھی کو دفتر اور رہائش گاہ بنالیا تھا۔ میجر بھی وہیں چلا گیا تھا۔ اس کے بعد پلٹ کر نہیں آیا۔ پتہ نہیں وہ واقعی بزدل تھا یا فوجی مصروفیات کے باعث عشق کا کچا دھاگہ ٹوٹ گیا تھا۔ ایسے وقت عورت کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے جب مرد اسے چاہے مگر چاہت سے آنا بھول جائے۔

تھوڑی دیر بعد اس کے باپ نے دروازے پر دستک دی الوینہ نے دروازہ کھول دیا مگر نظر اٹھا کر باپ کو دیکھنا گوارا نہ کیا۔ چپ چاپ اپنی خواب گاہ میں واپس آگئی۔ ڈیگن پال نے میز پر کھانے سے بھری ہوئی پلیٹیں دیکھ کر پوچھا۔

"کیا بات ہے تم نے ابھی تک کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

وہ غصے اور نفرت سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "ہم بیس برس سے جن لوگوں کے ساتھ ہیں کیا انہوں نے کھالیا ہے؟ کیا تم نے ان کے گھروں میں جھانک کر دیکھا ہے کہ ان کے بچے بھوک سے کس طرح بلک رہے ہیں؟"

"وہ نئی حکومت سے نافرمانی کی سزا پا رہے ہیں۔"

"تو پھر مجھے بھی سزا پانے دو میں بھوکی پیاسی مرجاؤں گی۔ مگر ایسے کھانے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی جو مجھے محکوم اور مجبور بنا کر زندہ رکھے گا۔"

"الوینہ! میں تمہیں بارہا سمجھا چکا ہوں کہ اس نئی حکومت کے خلاف کچھ نہ بولو۔ مگر تم سمجھنا نہیں چاہتیں۔ اگر تمہاری باغیانہ باتیں کرنل تک پہنچیں گی تو میں تمہیں سزا سے نہیں بچا سکوں گا۔"

"جو پورے ملک کو ڈبو چکا ہو' وہ مجھے کیا بچائے گا۔ تمہاری ملک دشمنی اور غداری نے مجھے لوگوں کی نظروں سے گرادیا ہے۔ سب مجھ پر تھوک رہے ہیں۔ اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے؟ مگر اس سزا کی اذیتوں کو میں ہی سمجھ سکتی ہوں۔ تمہارے جیسا بے غیرت انسان نہیں سمجھ سکتا۔"

"گستاخ۔" ڈیگن پال نے اس کے منہ پر طمانچہ رسید کردیا۔ "میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا۔ تم مجھے بے غیرت کہتی ہو۔ میں خون کے رشتے سے بے مروت بن کر بھی دکھادوں گا۔"

وہ چند لمحوں تک ہکابکا سی کھڑی رہی۔ طمانچہ کھا کر سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ خون کے رشتے سے بھی بے مروتی کرسکتا ہے۔ نئے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے بیٹی کی جان بھی لے سکتا ہے۔ یہ سمجھتے ہی وہ غصہ سے بپھر گئی۔ کھڑکی کھول کر کھانے کی پلیٹیں باہر پھینکنے لگی۔ ڈیگن پال نے اسے روکنا چاہا تو اس نے زور سے دھکا دیا۔ وہ بوڑھا تھا اور دھکا دینے والی جوانی تھی۔ اس لئے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ایک کرسی پر گرا۔ پھر وہاں سے الٹ کر فرش پر پہنچ گیا۔ الوینہ نے ایک بڑا سا گلدان اٹھا کر اس پر پھینکنا چاہا مگر وہ فوراً ہی فرش پر سے اٹھ کر بھاگتا ہوا خواب گاہ سے باہر نکل گیا۔ پھر وہاں سے گھونسہ دکھاتے ہوئے بولا۔

"میری اولاد اور مجھ سے دشمنی........... نہیں' تو میری بیٹی نہیں ہوسکتی ضرور اپنی ماں کا گناہ ہے۔ اب مجھ پر ظاہر ہو رہا ہے۔ میں تیرا جینا حرام کردوں گا۔ اب دیکھنا تجھے کرنل سے کیسی سزائیں ملتی ہیں۔"

یہ کہتے ہی وہ وہاں سے بھاگتا چلا گیا۔ الوینہ کے ہاتھ سے گلدان چھوٹ کر گر پڑا۔ اب باپ اسے اپنی بیٹی نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کی ماں کو گناہ گار بنا رہا تھا اور کرنل سے شکایت کرنے چلا گیا تھا۔ ایسا شخص جو بھی کر گزرے' وہ کم ہے۔ باپ نے خون کے رشتے سے انکار کیا تو وہ ایک دم سے خود کو نہتا اور بے یارومددگار سمجھنے لگی۔ اس مکان میں اس کا کوئی اپنا نہیں تھا۔ باہر جو اپنے تھے' وہ بھی دشمن بن گئے تھے اور اب کرنل کی طرف سے بھی عذاب نازل ہونے والا تھا۔

وہ کہاں جائے؟ کیا کرے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ گھبرا کر گھر سے نکل گئی۔ وہ ایک پتلون اور فر کا کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ سر سے کانوں تک اونی رومال

باندھ رکھا تھا۔ اس کے باوجود گھر سے باہر نکلتے ہی برفانی ہواؤں نے اسے کپکپادیا۔ ہوائیں سائیں سائیں کرتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ برف کے ذرات کہر کے دھندلکے کی طرح فضا میں پھیلے ہوئے تھے چاند مٹا مٹا سا تھا۔ وہ بھی اندر سے مٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا۔ ایک دم سے خود کو مٹادے۔ انسانوں کے اس بھرے جنگل میں اجنبی بن کر تنہا بھٹکنے سے بہتر تھا کہ وہ مرجاتی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہیں سے زندہ رہنے کا بہانہ مل جائے۔

رات کے سناٹے میں بستی ویران تھی کبھی کبھی مسلح فوجیوں کی آوازیں دور سے یوں سنائی دیتی تھیں جیسے جنگل میں گیدڑ پکار رہے ہوں۔ وہ سڑکوں پر گشت کرنے کے دوران آوازیں لگاتے تھے تاکہ دوسری طرف کہیں گشت کرنے والے فوجیوں کو خیریت کی اطلاع ملتی رہے۔ شہریوں نے ان کے دلوں پر دہشت بٹھادی تھی کہ کسی وقت بھی کسی بھی گلی کوچے میں کوئی فوجی مارا جاسکتا ہے۔

"ہالٹ.........." دور کسی فوجی نے اسے للکارا وہ رک گئی۔ مگر اس نے آواز کی سمت گھوم کر نہیں دیکھا۔ دماغ میں یہی بات سمائی ہوئی تھی کہ کوئی گولی مارتا ہے تو ماردے۔ زندگی میں کون سی دلکشی ہے کہ موت سے ڈرا جائے۔ دو فوجی اسٹن گن کا رخ اس کی طرف کئے محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے قریب آئے۔ ایک نے سخت لہجے میں کہا۔

"کون ہے..........؟ اباؤٹ ٹرن.........."

وہ ان کی طرف گھوم گئی۔ نیلے رومال کے حاشیے میں اس کا سرخی مائل حسین چہرہ دمک رہا تھا۔ برفیلی زمین کا نیلا عکس اس کی روشن آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ ڈیگین پال کی بیٹی کے حسن و شباب کا چرچا تمام فوج میں تھا۔ رات کی تنہائی میں اسے دیکھتے ہی دونوں فوجی جوان ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگے۔ ایک نے الوینہ کے شانے پر سے برف جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ارے یہ تو ڈیگین پال کی لڑکی ہے۔"

الوینہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر ایک قدم پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

"خبردار! مجھے ہاتھ نہ لگانا۔"

"میری جان! تم تو ہرنی کی طرح بدکتی ہو۔" ایک نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"سویٹی! ہم انسان ہیں۔ ہمارے بھی کچھ جذبات ہیں۔ آؤ ان جذبوں کی پیاس بجھادو۔" دوسرے نے اس کا دوسرا بازو تھام لیا۔ گھر سے نکلتے وقت وہ یہ بھول گئی تھی کہ دشمن درندے اس کی جوانی پر چھاپے ماریں گے اور کوئی اسے بچانے والا نہ ہوگا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔

"تم دونوں کی شامت آگئی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اس وقت میجر سلمان کے پاس جارہی ہوں۔"

وہ دونوں فوراً ہی اسے چھوڑ کر ایک قدم پیچھے چلے گئے۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ ڈیگین پال کی حسین لڑکی میجر کے لئے مخصوص ہے۔ ایک عام سپاہی اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ الوینہ انہیں حقارت سے دیکھ کر پھر اپنے راستے پر چلنے لگی۔ اس وقت اس کے دماغ نے پوچھا۔

"کیوں ری الوینہ! تو نے اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے میجر کا حوالہ کیوں دیا؟ وہ کون لگتا ہے تیرا؟ اس مصیبت کی گھڑی میں صرف وہی کیسے یاد آگیا؟"

سوالات کی بوچھاڑ سے وہ بوکھلا گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی زبان پر بے اختیار میجر کا نام کیوں آگیا تھا؟ فوجی کیا سوچتے ہوں گے؟ وہ فوجی تو سمجھائے بغیر سمجھ گئے ہوں گے کہ ایک جوان لڑکی اتنی رات کو میجر کے پاس کیوں جارہی ہے۔ باپ نے وطن بیچا' بیٹی تن بیچ رہی ہے۔

ایسا سوچتے وقت اس نے چشم تصور میں خود کو میجر سلمان کے قریب دیکھا وہ ایک دم سے کانپ گئی۔ وہ کپکپاہٹ سردی کی شدت سے نہیں' جذبوں کی حدت سے تھی۔ کچھ شرم وحیا سے بھی اور کچھ غصے اور نفرت سے بھی کہ وہ آپ ہی آپ سوچ کے ذریعے ایک دشمن سے کیوں وابستہ ہوتی جارہی ہے؟ کیا غصے اور نفرت کی کوکھ سے بھی ایسی انجانی سی محبت جنم لیتی ہے؟

وہ نفرت اور محبت کے متضاد جذبوں سے الجھتی ہوئی بستی میں پہنچ گئی۔ راستے کے دونوں طرف مکانات خاموش تھے۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ کبھی کبھی ان کے پیچھے سے بچوں کے رونے اور بوڑھوں کے کراہنے کی آوازیں آجاتی تھیں۔ وہ سب بھوک اور پیاس سے نڈھال ہورہے تھے۔ الوینہ ندامت سے مری جارہی تھی۔ یہ سچائی اسے مار رہی تھی کہ اس کے ہم وطنوں پر اس کے باپ کی وجہ سے یہ

مصیبتیں نازل ہو رہی ہیں۔ وہ بیچ سڑک پر کھڑی ہو کر بلند آواز سے کہنے لگی۔

"بستی والو.......... میرا باپ غدار ہے۔ میں قابلِ نفرت ہوں۔ باہر آؤ اور مجھے سنگسار کردو۔"

کوئی باہر نہیں آیا۔ مگر ایک ایک کر کے کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ راستے پر چلتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

"تم سمجھتے ہو' میں باپ کی حامی ہوں۔ باپ کہتا ہے' میں اس کی دشمن ہوں' اس کی اولاد نہیں ہوں۔ میں چکّی کے دوپاٹوں میں پس رہی ہوں۔ میرا باپ مجھے ان فوجیوں سے سزا دلوانا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے ہی میں تمہارے ہاتھوں سے سزا پانے آگئی ہوں۔"

ایک کھڑکی سے آواز آئی۔ "یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات ہے کہ تیرا باپ تجھے سزا دلائے گا۔"

دوسری کھڑکی سے ایک عورت نے کہا۔ "یہ اپنے باپ کی طرف سے کوئی نیا ڈرامہ کھیلنے آئی ہے۔"

تیسری طرف سے کسی مرد نے کہا۔ "اس کا باپ بہت بڑا ڈرامہ باز ہے۔ ہمارے فوجیوں کو کاک ٹیل پارٹی دے کر ہماری آزادی چھین لی۔ اب ہم یہودیوں کے فریب میں نہیں آئیں گے۔"

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر فریاد کرنے لگی۔ "مجھے الزام نہ دو بے شک میں ایک یہودی کی بیٹی ہوں مگر میری پرورش تمہارے درمیان ہوئی ہے.......... زرقا کی امی! جب میری ماں مرگئی تھی تو تم نے مجھے دودھ پلایا تھا اور میں دودھ کے رشتے سے مسلمان ہوں.......... شوبھا کے پتا جی! میرا بچپن تمہاری گود میں کھیلا ہے۔ گود کا بھی ایک رشتہ ہوتا ہے' ایک دھرم ہوتا ہے۔ اس دھرم کے ناطے میں ہندو ہوں.......... مدر میرلن! میں نے تمہاری صلیب کے سائے میں تعلیم حاصل کی ہے۔ علم کسی مذہب کی جاگیر نہیں ہوتا۔ وہ انسان کے سینہ بہ سینہ چلتا' بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ اس علم نے مجھے عیسائی بھی بنایا ہے.......... پھر تم سب اپنے دودھ' اپنی گود' اپنی تعلیم اور اپنے اپنے مذہب کا چٹخارہ دے کر مجھے صرف یہودی کیوں کہتے ہو؟ ایسا کہنے سے پہلے مجھے مار کیوں نہیں ڈالتے؟"

دور کسی کھڑکی سے آواز سنائی آئی۔ "غدار کی سزا موت ہے۔ تم اپنے ہاتھوں سے اپنے باپ کو یہ سزا دو اور ہم تمہیں گلے لگالیں گے۔"

اس بات نے الوینہ کو سمجھا دیا کہ وہ بچپن سے اب تک کے تعلقات کا واسطہ دے کر اور آنسو بہا کر ان کے دلوں سے نفرت کو نہیں دھو سکے گی۔ بلکہ اپنے باپ کے لہو سے یہ لکھ سکے گی کہ باپ اگر غدار ہو تو اپنی بیٹی بھی اسے کبھی معاف نہیں کرتی.......... ہاں وہ ایسا کر سکتی تھی۔ اگر باپ اپنی بیٹی کو فوجی آقاؤں کی نافرمانی کے جرم میں سزا دلانے کی دھمکی دے سکتا تھا تو بیٹی بھی وطن کو اور آزادی کو بیچنے کے الزام میں باپ کے لہو سے کھیل سکتی تھی۔ وہ یک بیک نئے عزم اور ارادے کے ساتھ ناظمِ اعلیٰ کی کوٹھی کی طرف پلٹ گئی۔ جہاں فوجیوں نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔ ڈیگن پال سے وہیں سامنا ہو سکتا تھا۔

بند ہونے والی کھڑکیاں پیچھے سے بڑبڑاتی رہیں.......... اونہہ باپ کو سزا دینے کی بات آئی تو منہ موڑ کر چلی گئی۔

الوینہ نے اپنے پیچھے بہت سی باتیں سنیں لیکن اس نے دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کس ارادے سے کہاں جا رہی ہے؟ وہ خود نہیں جانتی تھی کہ کسی ہتھیار کے بغیر وہ کیا کر سکے گی۔ بس اس کا جی چاہ رہا تھا کہ کسی طرح غدار کی گردن اس کے ہاتھوں میں آجائے۔ پھر وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ایک چوراہے پر "ہالٹ" کی آواز سنائی دی۔ اس نے وائیں طرف سر گھما کر دیکھا۔ ایک دکان کے چھجے کے تاریک سائے سے دو فوجی نشے میں لڑکھڑاتے ہوئے نکل رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔ برف کی بھربھری زمین پر وہ گرتے گرتے سنبھل رہے تھے۔

"کون ہو تم؟" وہ گرتے پڑتے قریب پہنچ گئے۔ ایک نے خمار آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے یہ تو پٹاخہ ہے۔"

الوینہ کے دماغ میں فوراً ہی یہ بات آئی کہ اس نے پھر میجر کا حوالہ نہ دیا تو ان شرابیوں کی ہوس کا نشانہ بن جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ کر بولی۔

"خبردار! میرے قریب نہ آنا.......... مم' میں میجر کے پاس جا رہی ہوں۔"

"جانی ہم بھی تو میجر کی طرح انسان ہیں۔ پہلے ہمارا دل خوش کردو۔"

دماغ میں شراب کا نشہ تھا اور نگاہوں کے سامنے شباب کا الاؤ دہک رہا تھا۔ ایسے وقت لوگ اللہ سے نہیں ڈرتے۔ پھر وہ میجر سے کیسے ڈر جاتے۔ ایک نے اپنی اسٹین گن ایک طرف پھینک کر الوینہ کو دونوں بازوؤں سے پکڑ لیا۔ پھر اسے جبراً چومنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ سر کو اِدھر اُدھر جھٹک کر خود کو بچا رہی تھی۔ دوسرے فوجی نے اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم سیدھی طرح قابو میں نہیں آؤ گی تو میں تمہیں جہنم میں............"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز گونج اٹھی اور وہ جہنم میں پہنچانے والا خود جہنم میں پہنچ گیا۔ کہیں قریب ہی کسی دکان کے تاریک سائے سے فائرنگ ہوئی تھی۔ دوسرا فوجی اپنے ساتھی کو دم توڑتے دیکھ کر فوراً ہی اپنی اسٹین گن کی طرف لپکا۔ الوینہ اس سے نجات پاتے ہی بھاگنے لگی۔ اسی وقت دوسرا فائر ہوا۔ وہ ایک دم سے لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دوسرا فوجی بھی گولی کھا کر برف میں دھنس گیا تھا۔

الوینہ کو فوراً ہی ان مجاہدوں کا خیال آیا جو رات کی تاریکی میں گشت کرنے والے فوجیوں پر دھاوا بولتے تھے۔ وہ چاروں طرف نظریں دوڑا کر اپنے محسنوں کو تلاش کرنے لگی۔ اسی وقت پھر چند فوجیوں کے للکارنے کی آوازیں آئیں۔ وہ اسٹین گنوں کا رخ اس کی جانب کئے چاروں طرف............ سے اسے گھیر رہے تھے۔ وہ تعداد میں چار تھے۔ پانچواں اس کا باپ ڈیگن پال تھا۔ اس نے بیٹی کو مخاطب کیا۔

"الوینہ! بغاوت کی سزا موت ہے۔ کرنل تجھے میری بیٹی سمجھ کر صرف نظر بند کرنا چاہتا تھا۔ مگر تُو نے ان دو فوجیوں کو مار کر اپنے نصیب میں موت کی سزا لکھوالی ہے۔ میں نئی حکومت کا وفادار ہوں۔ تیری کوئی مدد نہیں کروں گا۔"

الوینہ کو جواباً کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔ پھر کسی دکان کے تاریک سائے سے فائرنگ شروع ہوگئی۔ اسٹین گن کے پہلے ہی برسٹ میں دو فوجی گر پڑے۔ باقی دو فوجی کہیں مورچہ بنانے کے لئے کھلی جگہ سے بھاگنے لگے۔ مگر وہ بھی فائرنگ کی زد میں آگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میدان صاف ہوگیا۔ اس میدان میں صرف باپ بیٹی ایک دوسرے کے مقابل کھڑے رہ گئے۔ مسٹر ڈیگن پال میں اتنا حوصلہ کہاں تھا کہ وہ

اندھیرے سے فائرنگ ہونے والے ماحول میں کھڑا رہ جاتا۔ وہ پلٹ کر بھاگنے لگا۔ فائرنگ پھر شروع ہوگئی۔ گولیاں تڑتڑاتی ہوئی اس کے قدموں کے پاس پہنچ رہی تھیں۔ برف کے ذرات چاندی کے غبار کی طرح اُڑ رہے تھے۔ وہ حواس باختہ ہوکر اوندھے منہ برف پر گر پڑا۔

الوینہ نے پھر ایک بار آس پاس نظریں دوڑائیں۔ اس بار سمجھ میں آگیا کہ فائرنگ کرنے والا کوئی ایک ہی شخص ہے............ کون ہے وہ ابھی یہ جاننے کی فرصت نہیں تھی۔ وہ ایک مُردہ فوجی کی اسٹین گن اٹھا کر اس کا رخ اپنے باپ کی طرف کرتی ہوئی بولی۔

"بس پاپا............ اب تمہاری بے غیرت زندگی کی میعاد پوری ہوچکی ہے۔ چلو زمین پر سے اٹھو میں تمہیں زمین کی تہہ میں سلاؤں گی۔"

وہ اپنے کپڑوں پر سے برف جھاڑتے ہوئے اٹھنے لگا اور خوشامدانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگا۔

"بچی............ اپنے باپ کو اسٹین دکھا رہی ہے۔ میری بیٹی بچپن میں بھی نقلی پستول لے کر کہتی تھی پاپا میں چھوٹ کل دوں گی۔ (میں شوٹ کردوں گی)۔"

الوینہ کی آنکھوں میں اچانک آنسو آگئے۔

"پاپا............ میں اب بھی ایک ننھی سی بچی ہوں میرے پیدا ہوتے ہی ماں مرگئی۔ جوان ہوتے ہی باپ کی غیرت مرگئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ روح کے بغیر جسم مُردہ ہوتا ہے میں کہتی ہوں کہ غیرت کے بغیر تمہارا مُردہ جسم میرے سامنے کھڑا ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے فائرنگ کی مگر وہ اسٹین گن کو اپنے قابو میں نہ رکھ سکی۔ اس لئے تمام گولیاں ڈیگن پال کے قریب برف کو اڑاتی چلی گئیں۔ وہ پلٹ کر بھاگنے لگا۔ الوینہ اس کا تعاقب کرنے لگی۔ تھوڑی دور جاکر پھر فائرنگ کی۔ وہ گولیوں کی زد میں نہیں آیا مگر گھبراہٹ میں اوندھے منہ گر پڑا۔

"نہیں نہیں............ میری بچی............ تُو مجھے نہیں مارے گی مجھے راہ راست پر لانے کے لئے صرف دھمکی دے رہی ہے۔"

"تجھے راستی پر لانے کی اب کوئی راہ نہیں ہے کیونکہ تُو ہماری آزادی کی تمام راہیں مسدود کرچکا ہے۔"

پھر وہ بلند آواز میں کہنے لگی۔ "بستی والو.......... باہر آؤ اور دیکھو میں تمہارے فیصلے کے مطابق اپنے ہاتھوں سے اسے پہلی اور آخری سزا دوں گی۔"

کوئی باہر نہیں آیا۔ مگر دور تک کھڑکیاں کھلنے لگیں اور سر جھانکنے لگے۔ ڈیگن پال سڑک کے وسط میں برف پر گھسٹتے ہوئے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ الوینہ اس کے قریب پہنچ رہی تھی۔ اس نے اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

"پاپا.......... دور سے دوبار میرا نشانہ خطا ہو گیا مگر قریب سے نہیں ہوگا۔"

ایسا کہتے وقت بیٹی کی نظریں باپ سے ملیں تو اسٹین گن کو تھامنے والے ہاتھ کانپ گئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے وہ بچپن نظر آیا جو باپ کے سینے پر سر رکھ کر سوتا تھا۔ خون کی محبت اپنوں کے جرم کو نظرانداز کر دیتی ہے مگر اسی وقت آس پاس کے مکانوں سے فاقہ زدہ بچوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں اچانک ہی اسٹین گن پر الوینہ کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

"غدار! تو دوسروں کی اولاد کو بھوکا پیاسا مار رہا ہے۔ لے اب تیری اولاد تجھے مار رہی ہے.........."

تڑتڑاتڑ کی آواز دور تک ایک غدار کی موت کی خبر سناتی چلی گئی کھڑکیوں سے جھانکنے والے دم بخود تھے اور اب الوینہ کو محبت اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ اب اس کے لئے تمام گھروں کے دروازے کھل سکتے تھے۔ کتنے ہی لوگوں نے مختلف سمت سے اسے آوازیں دیں مگر وہ چند لمحوں کے لئے بالکل ساکت ہو گئی تھی کسی کی آواز کو نہیں سن رہی تھی۔ صرف باپ کے مردہ جسم کو دیکھ رہی تھی۔ جو برف میں دھنسا ہوا تھا۔

وہ آگے بڑھ کر برف پر دوزانو ہو گئی۔ جہاں وہ بچپن میں سر رکھ کر سویا کرتی تھی۔ وہ بوڑھا سینہ نگاہوں کے سامنے تھا وہ اس پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ وہ منصف بن کر سزا دے چکی تھی۔ اب بیٹی بن کر رونے کی سزا پا رہی تھی۔ مگر وہ زیادہ دیر تک ماتم نہ کر سکی۔ اس سڑک کے ایک موڑ سے پھر تین فوجی نمودار ہوئے۔ وہ فائرنگ کی آواز سن کر ادھر آئے تھے۔ آس پاس کی کھڑکیوں سے روشنیاں باہر آ رہی تھیں۔ ان روشنیوں میں الوینہ دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی فوجیوں نے فائرنگ کی دھمکی دی لیکن دھمکی پر عمل کرنے سے پہلے ہی ایک دیوار

کی آڑ میں فائرنگ شروع ہو گئی۔

آس پاس کی کھڑکیاں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ گولیوں کی زد میں برف کے ذرات اڑنے لگے۔ الوینہ کی ایک چیخ سنائی دی۔ اس کے چاروں طرف برف کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس غبار کے دھندلکے کے باہر دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ پھر ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ وہ فائرنگ کرنے والا دیوار کی آڑ سے نکل کر دوڑتا ہوا غبار کے دھندلکے میں آ گیا۔ پھر چند لمحے بعد الوینہ کو کاندھے پر لاد کر ایک طرف بھاگتا چلا گیا۔

☆------☆------☆

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنی خواب گاہ کے بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے بستر کے پائنتی دو مسلح فوجی کھڑے ہوئے تھے اور میجر سلمان اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ فوراً ہی اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی کہ وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی ہے۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو شانے میں تکلیف محسوس ہوئی۔ میجر سلمان نے اس کے ہاتھ کو پیار بھری نرمی سے دابتے ہوئے کہا۔

"ایزی بے بی! آرام سے لیٹی رہو۔ فی الحال کسی سے بات نہ کرو میں ابھی آتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک فوجی جوان کو اپنے ساتھ باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ مسلح جوان اس کے پیچھے چلتا ہوا خواب گاہ سے باہر چلا گیا۔ صرف ایک جوان بستر کے پائنتی الرٹ کھڑا رہا۔ الوینہ الجھے ہوئے ذہن سے سوچنے لگی کہ وہ کیسے فوجیوں کی قید میں آ گئی ہے۔ اگر کرنل وہاں ہوتا تو یقیناً اسے شوٹ کر دینے کا حکم دیتا۔ مگر میجر اس کے ساتھ نرمی سے پیش آ رہا تھا۔ کیا اس کی نرمی اور محبت اسے موت کی سزا سے بچا سکے گی؟

"مگر میں موت سے کب ڈرتی ہوں۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ میں میجر کی ہمدردی اور محبت کی بھی محتاج نہیں ہوں۔ میں ان غاصبوں سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گی۔"

وہ ایک نئے عزم سے اپنی مٹھیاں بھینچنے لگی۔ مٹھیاں بھینچنے کے باعث پھر بائیں شانے میں تکلیف محسوس ہوئی۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔ پھر اس نے جھنجلا کر کہا۔

"تم میری خواب گاہ میں کیوں کھڑے ہو؟ گیٹ آؤٹ............"

فوجی جوان نے کہا۔ "سوری میں اپنا فرض انجام دے رہا ہوں۔"

"مجھے یہاں کون لایا ہے؟"

"تمہیں میجر کا احسان مند ہونا چاہئے۔ یہاں کے چند باغیوں نے تمہارے باپ کو مار ڈالا ہے۔ وہ تمہیں بھی مارنا چاہتے تھے مگر میجر نے ان سب کو ختم کر دیا وہ تمہیں اٹھا کر لا رہا تھا کہ ہم راستے میں مل گئے اور تمہیں باحفاظت یہاں لے آئے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" وہ دائیں ہاتھ کے بل پر اٹھتی ہوئی بولی۔ "جنہیں تم باغی کہتے ہو۔ وہ محبِ وطن ہیں۔ میں نے اپنے وطن کے غدار کو' اپنے باپ کو خود اپنے ہاتھوں سے مارا ہے۔ مجھے ایک ریوالور دو۔ میں ابھی تمہیں اور تمہارے میجر کو شوٹ کروں گی۔"

فوجی جوان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ کیونکہ الوینہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر باغیانہ انداز میں اسے اور میجر کو شوٹ کرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔ اسی وقت باہر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ دوبار فائرنگ ہوئی تھی۔ الوینہ نے حقارت سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے مجاہدوں نے تمہارے میجر اور اس فوجی کا صفایا کر دیا ہے۔"

اس کے سامنے کھڑا فوجی فوراً ہی اسٹین گن سنبھالتا ہوا بیرونی دروازے کے پاس گیا۔ وہاں سے آواز دی۔ "ہیلو میجر! آپ خیریت سے ہیں۔"

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ واپس دوڑتا ہو پچھلے زینے کے پاس آیا پھر تیزی سے زینہ طے کرتا ہوا چھت پر پہنچا۔ میجر سلمان ریوالور لئے کھڑا تھا۔ اس نے کہا۔ "پہلے فائر سے تمہارا ساتھی مر گیا۔ دوسرا فائر میں نے اپنے نام پر کیا تاکہ تم مجھے مُردہ سمجھ کر دشمنوں سے نمٹنے کے لئے چھت پر آؤ' تم دروازہ کھول کر باہر جانے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔ بہرحال اب یہ تیسرا فائر تمہارے لئے ہے۔"

تیسرے فائر کی آواز سن کر الوینہ کے دل میں درد پیدا ہوا۔ اس نے اپنی زبان سے سلمان کے مرنے کی بات کی تھی۔ اسی زبان سے وہ میجر سلمان کا حوالہ دے کر دشمن فوجیوں سے اپنی عزت بچاتی رہی تھی۔ وہ نڈھال سی ہو کر بستر پر گر پڑی۔

اب برآمدے سے بھاری بھرکم قدموں کی آواز آرہی تھی۔ پھر مکان کا بیرونی

دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ قدم مکان کے اندرونی فرش پر دھمکنے لگے کچن کی طرف گم ہونے لگے۔ پھر دوبارہ بیڈ روم کی جانب ابھرنے لگے۔ الوینہ نے دھڑکتے ہوئے دل سے سر اٹھا کر دروازے کی سمت دیکھا۔ سلمان ہاتھوں میں کھانے کی پلیٹیں اٹھائے اس کے قریب آرہا تھا وہ حیرانی سے بولی۔ "تم............ تم زندہ ہو؟"

اس نے کھانے کی پلیٹوں کو ایک میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"اٹھو' کچھ کھالو۔ میں جانتا ہوں کہ دوسرے شہریوں کی طرح تم بھی بھوکی پیاسی ہو۔"

"میں بھوکی مر جاؤں گی مگر تنہا اپنا پیٹ نہیں بھروں گی۔ میرے ہم وطنوں کے منہ سے لقمہ چھین کر مجھ سے ہمدردی اور محبت جتانے آئے ہو' تمہیں شرم نہیں آتی؟"

سلمان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے شرم آگئی ہے۔ اسی لئے تمہارے پاس آگیا ہوں میرے لباس کو دیکھو۔ اس سینے پر تمہارا سر رکھنے کے لئے میں نے تمام تمغے نوچ کر پھینک دیئے ہیں۔"

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے سلمان کے سینے کو تکنے لگی۔ واقعی اب وہاں تمغے نہیں تھے۔ چشم تصور میں وہ اپنا سر وہاں رکھ رہی تھی۔ پھر وہ فوراً ہی سر جھٹک کر بولی۔

"کیا تم وہ سارے تمغے اتار کر مجھے فریب دینے آئے ہو؟"

"نہیں جانِ حیات! مجھ پر بھروسہ کرو جب تمہارے باپ نے کرنل کے پاس آکر تمہاری شکایت کی تو اس وقت میرے ضمیر نے مجھے جھنجھوڑ کر پوچھا کہ یہ کیسی سیاست ہے؟ کیسی جنگ ہے؟ اقتدار اور تمغے حاصل کرنے کی کیسی خواہش ہے کہ باپ اپنی وطن پرست بیٹی کو باغی کہہ کر غاصبوں سے سزا دلانا چاہتا ہے۔ اس لمحے میں نے چشم تصور میں دیکھا کہ فوجی عدالت میں تمہیں سزا سنائی جارہی ہے۔ تم اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہو اور تمہاری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔"

وہ چند ساعتوں کے لئے چپ ہو کر الوینہ کی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ ان آنکھوں کے پیچھے اس کی مرحوم بیوی کی آنکھیں رو رہی تھیں اور وہ آنسو بہہ رہے تھے جو لام سے واپس آنے والے سپاہی کی انگلیوں کا انتظار کرتے کرتے قبر کی مٹی میں مل گئے تھے۔ وہ ایک گہری سانس کھینچ کر بولا۔

"اب میں تمہاری آنکھوں کو رونے نہیں دوں گا۔ مشین گن کی زد پر عورتوں کو رلانا مردانگی نہیں ہے۔ مرد تو وہ ہے جو آنسو پونچھنے کا جذبہ رکھتا ہو اسی جذبے کے تحت میں نے اپنے ہی فوجیوں پر گولیاں چلائیں کیونکہ وہ تمہاری عزت سے کھیل کر تمہیں رلانا چاہتے تھے۔"

اب الوینہ کی سمجھ میں آیا کہ چھپ چھپ کر گولیاں برسانے والا اس کی عزت اور اس کی جان بچانے والا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے ہولسٹر سے ریوالور نکال کر الوینہ کے سامنے بستر پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"اگر اب بھی تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں ہے تو یہ ریوالور اٹھا کر نشانہ لو۔ میرا سینہ بہت چوڑا ہے۔ مگر اپنی ایک بات یاد رکھنا کہ محبت میں عورت زندگی لیتی نہیں' زندگی دیتی ہے............"

وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ریوالور کو ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ اب اس کے دل کی دھڑکنیں ٹھائیں ٹھائیں بج رہی تھیں۔ سلمان نے اس کے قریب آکر بستر کے سرے پر بیٹھتے ہوئے ہولے سے آواز دی۔

"الوینہ............ میں تمہارے ساتھ جان دینے آیا ہوں۔"

وہ بے اختیار پھولوں بھری شاخ کی طرح اس پر جھک گئی۔ اس کا سر سپاہی کے سینے پر تمغے کی طرح سج گیا۔ کتنا چوڑا سینہ تھا جزیرے کی طرح پھیلا ہوا اور آسمان کی طرح اس کے وجود پر چھایا ہوا تھا۔ وہ انتظار کے خشک ریگستان میں برسوں چلتی رہی' آبلہ پا ہوتی رہی۔ تب کہیں جاکر فولادی بازوؤں کا ایک گھر اور دھڑکتے ہوئے سینے کا ایک بستر ملا تھا۔

اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ اس نے فوراً ہی آنکھیں بند کرلیں۔ بعض اوقات تھک ہار کر جیتنے کے بعد بھی رونا آجاتا ہے۔ اس طرح آنسوؤں کے راستے پچھلی مایوسیوں اور غموں کا میل ڈھل جاتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پالینے کا چپ چاپ یقین کرتے رہے۔ وہ ایسے لمحات تھے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے سے ساری دنیا مٹ گئی تھی۔ وہ تھی اور وہ تھا اور کوئی نہ تھا۔ مشین گنوں کی تڑاتڑ نہیں تھی۔ دھڑکتے دل گنگنا رہے تھے بارود کی بو نہیں تھی۔ قربت معطر ہو رہی تھی۔

تب اس نے بھیگی پلکوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے ایسے وقت آنسو پونچھنے کا انداز بدل جاتا ہے۔ دل کے گھر سے آنے والے آنسوؤں کو ہونٹوں کی پچکار سے اور ملائم بوسوں کے رومال سے پونچھا جاتا ہے۔ الوینہ بند آنکھوں کے پیچھے اس چھاتہ بردار سپاہی کو دیکھ رہی تھی جو محبت کے آسمان سے اتر رہا تھا اور ہولے ہولے کہہ رہا تھا۔

"یاد ہے الوینہ! جب میں نے پہلی بار تمہارے آنسو پونچھے تھے اور پہلی بار تمہیں اپنانے کی خواہش ظاہر کی تھی تو تم نے انکار بھی نہیں کیا تھا' اقرار بھی نہیں کیا تھا۔ صرف ایک آزمائش میں مبتلا کرکے چھوڑ دیا تھا۔"

ہاں' اسے سب کچھ یاد تھا۔ وہ چپ چاپ اثبات میں سرہلا کر رہ گئی۔

"میری الوینہ! تم نے کہا تھا کہ تم سے محبت کرنے کے لئے مجھے تمہاری آزادی سے بھی محبت کرنی ہوگی۔ واقعی تم نے مجھے بڑی آزمائش میں مبتلا کردیا تھا۔ اس رات کے بعد میں کبھی پوری نیند نہ سوسکا۔ تمہاری محبت مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگاتی رہی۔"

"ہاں محبت اور نیند ایک جگہ نہیں رہتیں۔ جب محبت آتی ہے تو نیند چلی جاتی ہے۔" الوینہ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "پتہ نہیں مجھے بھی کیا ہو گیا تھا۔ اس رات کے بعد میں بھی نہ سو سکی۔ میں بار بار تمہارے خیال کو اپنے دل سے نکالتی رہی اور تمہارا خیال بار بار آنکھوں سے نیند اڑاتا رہا۔ اب گہری نیند آئے گی۔ مجھے سونے کی جگہ مل گئی ہے۔"

اسے جگہ مل گئی تھی۔ سر اسی طرح اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا وہاں سے زیادہ آرام اور کہاں ملتا؟ مگر سلمان نے بڑی حسرت سے کہا۔

"میرا بھی جی چاہتا ہے کہ تمہیں بازوؤں میں سمیٹ کر اب اطمینان سے سو جاؤں مگر ابھی ہمارا رت جگا ختم نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ جو تمہارے دشمن ہیں وہ اب میرے بھی دشمن ہیں۔ وہ صرف آزادی کے ہی نہیں' محبت کے بھی دشمن ہیں۔ ان کے درمیان رہ کر ہم پیار کا ایک لمحہ بھی سکون سے نہیں گزار سکیں گے۔"

"ہاں' ہمارے چاروں طرف خطرہ ہے۔ تمہاری پناہ میں آکر میں ذرا دیر کے لئے خطرات کو بھول گئی تھی۔"

"میں نہیں بھولا کیونکہ میں سپاہی ہوں۔ اس جنگ میں ایک محبت کرنے والی بیوی کو ہارنے کے بعد اب تمہیں ہار جانے کی غلطی نہیں کروں گا۔ تمہاری حفاظت کے

لئے جاگتا رہوں گا۔"

"میں بھی جاگتی رہوں گی۔"

"تو پھر اٹھو کچھ کھالو۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں ہمیں کھانے پینے کا بھی موقع نہ ملے۔ کرنل کو میری بغاوت کا علم ہو گا تو اس کے فوجی جوان اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے۔"

"اب میں ضرور کھاؤں گی۔ تم بھی میرا ساتھ دو۔"

"میں کھا چکا ہوں۔ اب مشین گن اور کارتوس کی پیٹیاں لے کر چھت پر جا رہا ہوں۔ تم کھانے کے بعد کافی کا تھرماس لے کر اوپر آجانا۔"

وہ بستر سے اٹھ گیا۔ وہ بھی اس کے روبرو آکر کھڑی ہو گئی پھر اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر بولی۔

"ہم تنہا کب تک لڑیں گے؟ اگر تم کہو تو میں ان نوجوانوں سے کسی طرح رابطہ قائم کروں' جو آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔"

"ہاں اگر وہ تمام مجاہد ہمارا ساتھ دیں تو ہم یہاں اپنا ایک مضبوط محاذ بنا سکتے ہیں۔"

"اچھا تو ابھی میں کچھ کھانے پینے کے بعد ان کی تلاش میں جاؤں گی۔"

"میں تمہیں تنہا نہیں جانے دوں گا۔ پہلے مجھے چھت پر ایک مورچہ بنا لینے دو۔ پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

سلمان نے جھک کر اس کے لبوں کو ہلکا سا بوسہ دیا۔ پھر اس خوابگاہ سے باہر چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک شرمائی شرمائی سی کھڑی رہی پھر چھوٹی سی میز کے پاس کھانے کے لئے بیٹھ گئی۔ کھانے کے دوران وہ اسی کے متعلق سوچتی رہی۔ بڑی سہانی سوچیں تھیں۔ آنکھوں پر نیند کا جادو چل جائے تو خواب پیچھا نہیں چھوڑتے اور دماغ پر کوئی محبت کا سحر پھونک دے تو رنگا رنگ سوچیں پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ یہ سوچیں بارود کے دھماکوں اور موت کی پیہم للکار کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں۔ خلوت ہو یا جلوت ہر جگہ اسی محبوب کی دل کی لگی سے گدگدا کر دل لگی کرتی رہتی ہیں۔

کھانا کھانے کے بعد وہ کافی سے بھرا ہو تھرماس اٹھا کر چھت کی طرف جانے لگی۔ اتنے میں اسے باہر بہت سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں اس نے فوراً ہی لائٹ آف

کر دی۔ پھر وہ تاریکی میں چلتی ہوئی ایک کھڑکی کے پاس آئی اور اس کے پردے کو ذرا سا سرکا کر باہر دیکھنے لگی۔ باہر بہت سے فوجی قطاروں میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے قریب لیفٹیننٹ مارک نظر آرہا تھا۔ اس نے مکان کی طرف رخ کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

"الوینہ! تمہارے خلاف بغاوت کا الزام ہے۔ ہمارے ایک فوجی جوان نے رپورٹ دی ہے کہ تم نے ڈیگن پال کو قتل کیا ہے' جو ہمارا وفادار تھا اور جو تمہارا باپ تھا۔ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ فوراً باہر آکر خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دو۔ ورنہ تمہیں جبراً فوجی عدالت میں پہنچا دیا جائے گا۔"

وہ فوراً ہی کھڑکی کا پردہ چھوڑ کر زینے کی طرف جانے کے لئے پلٹ گئی۔ تاریکی میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا مگر وہ اندھیرے میں اپنے گھر کے تمام دروازوں اور راستوں کو سمجھ کر وہاں سے گزر سکتی تھی۔ جب وہ چھت پر جانے کے لئے زینے پر پہنچی تو سلمان اوپری زینے سے آرہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر الوینہ کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"جلدی آؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مکان میں گھس آئیں۔ انہیں کسی طرح یہاں سے دور بھگانا ہو گا۔"

باہر سے لیفٹیننٹ مارک کی آواز آرہی تھی۔

الوینہ! ہم جانتے ہیں کہ تم اندر موجود ہو' میں دس تک گن رہا ہوں اگر تم باہر نہیں آؤ گی تو ہم آنسو گیس کے شیل پھینکیں گے۔ ون............ ٹو............ تھری............ فور............"

وہ دونوں دوڑتے ہوئے چھت پر آگئے وہاں ایک مشین گن چھت کی منڈیر سے لگی ہوئی تھی۔ ایک لکڑی کے چوڑے تختے پر گرینیڈ اور کارتوسوں کے بکس رکھے ہوئے تھے لکڑی کا تختہ اس لئے رکھا گیا تھا کہ چھت پر برف جم رہی تھی۔ الوینہ کو ایک بیلچہ بھی نظر آیا۔ سلمان اس سے برف اٹھا کر مکان کے پیچھے پھینکتا رہا تھا۔ اس نے الوینہ کو اپنا ریوالور دیتے ہوئے کہا۔

"اسے اپنے ہاتھ میں رکھو اور یہاں تختے پر بیٹھو۔ فائرنگ کے وقت ذرا بھی نہ اٹھنا۔"

وہ دو عدد گرینیڈ نکال کر مشین گن کے پاس آگیا۔ باہر نو تک گنتی ہو چکی تھی۔

"دس" کی آواز آتے ہی سلمان نے ایک گرینیڈ کو منہ سے لگایا پھر "کی" ہٹا کر اسے نیچے کھڑے ہوئے فوجیوں کی طرف پھینک دیا اور دوسرے ہی لمحے ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ کتنی ہی چیخیں سنائی دیں۔ زندہ بچنے والے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ مگر مکان کے چاروں طرف کھلا میدان تھا کہیں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ اسی وقت مشین گن سے تڑا تڑ گولیاں چلنے لگیں بھاگنے والے گرنے لگے کچھ مکان کے پیچھے جانے لگے۔ سلمان نے مشین گن کو چھوڑ دیا۔ ایک اسٹین گن اٹھا کر چھت کے دائیں طرف دوڑتا ہوا گیا۔ پھر وہاں سے فائرنگ کرنے لگا اسی طرح وہ دوڑتا ہوا مکان کے پچھلے حصے کی طرف پہنچ کر چھت پر فائرنگ کرنے لگا۔

الوینہ چپ چاپ بیٹھی نہ رہ سکی۔ وہ دوسری اسٹین گن اٹھا کر چھت کے بائیں طرف پہنچی اور ٹھیک وقت پر پہنچی۔ ایک سپاہی چھت کی طرف گرینیڈ پھینکنے ہی والا تھا اس کے فائرنگ کرتے ہی وہ اچھل کر برف پر گرا۔ گرینیڈ اس سے کچھ فاصلے پر گر گیا۔ پھر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔

یہ آگ اور خون کا کھیل صرف دس منٹ تک جاری رہا پھر ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ دور بہت دور دو فوجی جوان بھاگتے ہوئے نظر آرہے تھے چاندنی میں وہ سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ شوٹنگ رینج سے باہر نکل چکے تھے اس لئے سلمان نے فائرنگ نہیں کی۔ وہ دونوں چھت پر چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگے کہ کوئی رہ تو نہیں گیا ہے؟ مگر جلدی ہی اطمینان ہوگیا کہ یہ بازی انہوں نے جیت لی ہے۔

ویسے دو بھاگنے والے فوجیوں کے باعث خطرہ بڑھ گیا تھا۔ دوسری بار وہ بھاری مقدار میں چاروں طرف سے گھیرنے کے لئے آسکتے تھے۔ مگر ابھی ذرا دیر تھی۔ سلمان نے اسٹین گن کو لکڑی کے تختے پر رکھ کر الوینہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔

"تمہیں سردی لگ رہی ہے۔"

"ن۔ نہیں......... تمہارے پاس نہیں لگ رہی ہے۔"

"میری جان! محبت کے محاذ سے ایک نئی جنگ کا آغاز ہوچکا ہے۔ ہم اس کا انجام نہیں جانتے اور ہمیں انجام کی پرواہ بھی نہیں ہے۔ ہم بارود کے موسم میں کھلنے والے پھول ہیں۔ اگر ہم مر بھی گئے تو ہماری خوشبو نہیں مرے گی۔ یہ خوشبو محبت کے

دوسرے پھول کھلائے گی۔"

یہ کہہ کر وہ اپنے پھول کی تازگی پر جھک گیا اور اسے پیار کی حرارت سے آشنا کرنے لگا۔ مگر سردی چاروں طرف تھی۔ وہ دونوں ہی ہولے ہولے کانپ رہے تھے کھلی چھت تھی اور کھلے آسمان سے برف گر رہی تھی۔ وہ دشمنوں سے تاحیات لڑسکتے تھے لیکن آسمان سے کون لڑسکتا ہے اور کب تک لڑسکتا ہے۔

☆------☆------☆

کرنل لارنس کی فوجی پناہ گاہ میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ اب تک تقریباً پچاس فوجی مارے جاچکے تھے۔ شام سے میجر سلمان غائب تھا۔ آدھی رات تک اس کا پتہ نہ چلا تو کرنل یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ میجر بھی باغیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے اور اس کی لاش کو کہیں برف میں دفن کردیا گیا ہے۔ اب کرنل اسی ڈر سے باہر نہیں نکل رہا تھا کہ اسی طرح تمام فوجی افسر مارے جائیں گے تو فوج کمانڈ کرنے والوں کے بغیر کہیں کی نہیں رہے گی۔ اس نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس جزیرے کے چار بڑوں کو طلب کیا جو اسی کوٹھی میں نظربند کئے گئے تھے۔ کرنل کو سب سے زیادہ پریشانی یہ تھی کہ امداد کے طور پر باہر سے کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ٹرانسیٹر کے ذریعے اطلاع ملی تھی کہ فوج کا بڑا حصہ سمندر پار دشمنوں سے نبرد آزما ہے لہٰذا ایک طیارہ بھی فی الحال جزیرے کی طرف بھیجا نہیں جاسکتا۔

عشام جعفری، بیلے کرونا، جگ جیت اور فادر بنجامن حاضر ہوگئے۔ کرنل نے ان چاروں کو باری باری گھورتے ہوئے کہا۔

"تم سب اقتدار کے بھوکے ہو اور اپنے عوام کو بھوکا مار رہے ہو ہم نے ساتھ گھنٹے سے دانہ پانی بند کر رکھا ہے۔ جاؤ اور شہر میں جاکر دیکھو کہ تمہارے لوگ کس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہیں۔ اگر ان سے ذرا بھی ہمدردی ہے تو انہیں جاکر سمجھاؤ۔ باغیوں سے کہو کہ ہتھیار پھینک دیں۔"

عشام جعفری نے کہا۔ "جنہیں تم باغی کہہ رہے ہو وہ محبِ وطن ہیں۔ جو شہری بھوک پیاس سے مر رہے ہیں۔ ان کا ہمیں افسوس ہے مگر کیا کیا جائے۔ آزادی کے لئے جان کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ کرنل! ہم نہیں جانتے کہ ہمارے کتنے لوگ مر رہے ہیں۔ تم اپنے مرنے والوں کو اپنی انگلیوں پر گنتے رہو۔"

"اونہہ.........!" کرنل نے اپنی پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "یہ تم لوگوں کی خوش فہمی ہے کہ ہمارے فوجی مارے جا رہے ہیں۔ میرا ایک ایک سپاہی اپنی جگہ محفوظ ہے۔"

"لاشیں برف کے نیچے محفوظ ہی رہتی ہیں۔" جگ جیت نے چوٹ کی۔ بیلے کرونا مسکرانے لگا۔

"یوشٹ اپ۔" کرنل نے چیخ کر کہا۔ "میں تم سب کو برف کی تہہ میں دفن کردوں گا۔"

اتنے میں لیفٹیننٹ مارک دروازہ کھول کر لڑکھڑاتا ہوا اندر آیا پھر فرش پر گر کر بری طرح ہانپنے لگا۔ اس کا چہرہ لہو سے بھیگ رہا تھا۔ اس کا بایاں بازو بھی خون آلود تھا۔ کرنل اسے پریشان نظروں سے دیکھنے لگا وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرے بیچ کے ستائیس سپاہی مارے جاچکے ہیں۔ الوینہ وہاں تنہا نہیں ہے مکان کی چھت پر پتہ نہیں کتنے باغی ہیں وہ چھت پر چاروں طرف سے فائرنگ کررہے تھے۔ انہوں نے ہینڈ گرینیڈ بھی استعمال کئے ہیں۔"

کرنل پر چند لمحوں تک سکتہ طاری رہا۔ پھر اس نے ایک سپاہی کو زخمی لیفٹیننٹ کی مرہم پٹی کے لئے کہا۔ اس کے بعد کیپٹن بیننگ کو مخاطب کیا۔

"کیپٹن! تم سپاہیوں کا ایک بیچ لے کر جاؤ اور اس مکان کو چاروں طرف سے گھیر لو........."

لیفٹیننٹ مارک نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

"جناب! قطع کلامی معاف کریں۔ شاید آپ بھول گئے ہیں کہ اس مکان کے چاروں طرف کھلا میدان ہے۔ اس طرف مارچ کرتے ہی ہمارے آدمی ان کی نظروں میں آجائیں گے۔"

کرنل کی پیشانی پر شکنیں پھیل گئیں۔ مارک بتا رہا تھا کہ اس مکان کے قریب جو پہلی عمارت ہے وہ ریکریشن ہال ہے۔ اس عمارت کو بھی مورچہ بنا کر وہاں سے فائرنگ نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہاں سے بھی وہ مکان شوٹنگ رینج میں نہیں ہے۔ اب اس مکان کو اور وہاں کے لڑنے والوں کو صرف ہوائی حملے سے تباہ کیا جاسکتا تھا مگر اس کے پاس ایک بھی طیارہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی طیارہ فوری امداد کے لئے باہر سے آسکتا تھا۔

ہیڈکوارٹر سے معذوری کا اظہار ہوچکا تھا۔ اب اپنی غلط پلاننگ کا احساس ہورہا تھا۔ جزیرے کو اہم فوجی اڈہ بنانے کے لئے وہ یہاں گھس آئے تھے۔ مگر یہاں دوسری صبح تک قابض رہنا تقریباً ناممکن ہوگیا تھا۔ انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ہیڈکوارٹر پر بھی افتاد آپڑے گی۔

کرنل نے جھنجلا کر کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔ الوینہ کو کسی طرح بھی گرفتار کرو یا مار ڈالو۔ اس لڑکی نے اپنے باپ کو قتل کرکے بغاوت کی آگ اور بھڑکادی ہے۔ اسی لئے باغی اس کی مدد کررہے ہیں۔"

عشام جعفری بیلے کرونا اور فادر بنجامن وغیرہ نے یہ بات حیرانی سے سنی کہ الوینہ نے اپنے غدار باپ کو اپنے ہاتھوں سے موت کی سزا دی ہے۔ جگ جیت نے مارے خوشی کے ہونٹوں سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"اوئے بلے بلے.......... یہودی کی بیٹی نے تو بڑا کام دکھایا ہے۔"

بیلے کرونا نے کہا۔ "کرنل! حب الوطنی کی جو مثال الوینہ جیسی عورت نے پیش کی ہے اب اس کے پیش نظر تم یہ کیسے سوچ سکتے ہو کہ ہم جیسے مرد تمہاری فوجی طاقت کے سامنے جھک جائیں گے۔"

کرنل ان چاروں کو بڑی گہری اور چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کیپٹن بیننگ سے کہا۔

"ان چاروں کو الوینہ کے مکان کے قریب لے آؤ اور اس سے کہو کہ وہ اور اس کے ساتھی ہتھیار نہیں پھینکیں گے تو جزیرے کے ان چار بڑوں کو اس کے سامنے شوٹ کردیا جائے گا۔"

عشام جعفری نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "جس لڑکی نے آزادی کی خاطر اپنے باپ کو قتل کیا ہے وہ ہماری قربانیوں سے بھی دریغ نہیں کرے گی۔"

"تو پھر اس شہر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس کے سامنے قتل کیا جائے گا۔"

کرنل نے بڑی سفاکی سے کہا۔ "انہیں فوراً یہاں سے لے جاؤ۔"

ان چاروں کے اطراف اسٹین گن کی نالیں اٹھ گئیں۔ انہوں نے فوجیوں کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کیا۔ چپ چاپ باہر چلے گئے۔ باہر ایک چھوٹی سی فوج ترتیب دی جارہی تھی۔ سپاہیوں کو سمجھایا جارہا تھا کہ ڈیگن پال کے مکان کو اس طرح

چاروں طرف سے گھیرنا ہے کہ وہ باغیوں کی شوٹنگ رینج سے باہر ہی رہیں۔ صرف چھ سپاہی اس جزیرے کے چار بڑوں کو مکان کے قریب لے جائیں گے اور چھپے ہوئے باغیوں کو باہر آنے پر مجبور کریں گے۔ ہرلحاظ سے مکمل منصوبہ بنانے کے بعد فوج نے اس مکان کی جانب مارچ کیا' جو آزادی کی جنگ کا پہلا محاذ تھا۔ وہ چاروں قیدیوں کی حیثیت سے ان کے درمیان چل رہے تھے۔

برف کے تودے پہاڑ بنتے جارہے تھے۔ درختوں اور مکانات کو چاروں طرف سے چھپاتے جارہے تھے کھلی چھت پر الوینہ اور سلمان کی بُری حالت تھی۔ وہ دونوں بیلچے سے برف اٹھاکر باہر پھینکتے پھینکتے تھکن سے چُور ہوگئے تھے اور برف تھی کہ تہہ پہ تہہ جمتی ہوئی منڈیرے سے اوپر پہاڑ بن جانا چاہتی تھی۔ سخت محنت کے باعث الوینہ کے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے۔ انگلیاں اکڑ گئی تھیں۔ وہ تھک ہار کر گر پڑی۔ سلمان نے فوراً آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ "جان! میری جان! تم کمرے میں جاکر آتشدان میں آگ جلاؤ اور آرام سے سوجاؤ۔"

الوینہ نے جھکی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر بولی۔ "نہیں آج قیامت کا رت جگا ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں سوؤں گی۔"

سلمان نے بے بسی سے سر اٹھاکر آسمان کو دیکھا۔ ظالم آسمان برف کی گولہ باری میں مصروف تھا۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ برفباری میں شدت آگئی تھی۔ فضا میں چاروں طرف سفید دھند کی دبیز چادر پھیلی ہوئی تھی۔ مارچ کرنے والے فوجیوں کو سامنے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کبھی کبھی فائرنگ کی مسلسل آوازیں آتی تھیں۔ پھر سناٹا چھا جاتا تھا۔ صاف ظاہر.......... تھا کہ دور دور تک اب تمام محبِ وطن پوری طرح حرکت میں آگئے ہیں۔ فائرنگ کی آوازیں سن کر وہ تمام فوجی اندر سے کمزور پڑ رہے تھے۔ انہیں اپنا انجام نظر آرہا تھا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اب تک کتنے سپاہی باغیوں کے یکے دکے حملوں سے مارے گئے ہیں۔ ایسے وقت برف باری کی دھند میں چھپے ہوئے باغی کہیں بھی کسی وقت بھی دھاوا بول سکتے تھے۔

الوینہ کا مکان نظر نہیں آتا تھا۔ دھند میں غائب ہوچکا تھا وہ لوگ اندازے کے مطابق مارچ کرتے ہوئے میدان میں پہنچ گئے مگر اندازہ غلط بھی ہوجاتا ہے لہٰذا وہ

شوٹنگ رینج کے اندر پہنچ گئے۔ تمام راستوں پر برف کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ فوجیوں کے بھاری بھرکم بوٹوں کی آوازیں نہیں ابھرتی تھیں۔ الوینہ اور سلمان بھی یقیناً ان کی آمد سے بے خبر ہوں گے۔ کیپٹن بینٹنک نے اپنے سپاہیوں کو اسی جگہ رکنے کے لئے کہا۔ پھر چھ سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ چاروں کو لے کر اندازے کے مطابق مکان کے قریب جائیں اور باغیوں کو باہر آنے پر مجبور کریں۔

چھ سپاہی ان چاروں کو قیدیوں کی طرح اسٹین گنوں کی زد پر آگے بڑھاتے لے گئے۔ کچھ دور چلنے کے بعد بھی وہ مکان نظر نہیں آیا تو وہ رک گئے۔ ان میں سے ایک سپاہی نے آواز دی۔

"الوینہ..........! ہماری آواز سنتے ہی فائر نہ کرنا.......... یہاں اس جزیرے کے چار بڑے موجود ہیں۔ ہمارے ساتھ یہ بھی تمہاری فائرنگ کی زد میں آجائیں گے۔"

تھوڑی دیر تک پُراسرار سی خاموشی چھائی رہی۔ دوسری طرف سے جواب نہیں مل رہا تھا۔ سپاہی نے کہا۔

"ہم تمہارے اطمینان کے لئے ان کی آوازیں سناتے ہیں۔ یہ چاروں تمہیں مخاطب کریں گے۔ یہ تمہیں بتائیں گے کہ اگر تم اور تمہارے ساتھیوں نے ہتھیار نہیں پھینکے تو انہیں اسی جگہ شوٹ کردیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر سپاہی نے سٹین گن کی نال سے عشام جعفری کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

"کم آن.......... پہلے تم الوینہ کو مخاطب کرو۔"

عشام جعفری کے ہونٹ مضبوطی سے بند تھے۔ اس نے نفی میں سرہلادیا۔ سپاہی نے بیلے کرونا کو دیکھا وہ بھی انکار میں سرہلارہا تھا فادر بنجامن سینے پر صلیب کا نشان بناکر چپ ہوگیا۔ سپاہی نے جھنجلا کر جگ جیت سے کہا۔

"منہ سے کچھ پھوٹو۔ ورنہ باغی یہی سمجھیں گے کہ تم سب یہاں موجود نہیں ہو وہ سمجھیں گے کہ ہم انہیں دھوکہ دینے آئے ہیں۔ بیوقوفو! وہ فائرنگ شروع کردیں گے کیا تم اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں مرنا چاہتے ہو؟"

جگ جیت پہلے تو بتیسی دکھاکر مسکرایا۔ پھر اچانک ہی سپاہی کے منہ پر تھوک دیا۔ سپاہی مارے غصہ کے کھوپڑی سے باہر ہوگیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے جگ جیت کو

گولی کا نشانہ بنا دیا۔ فائرنگ کی آواز ہوتے ہی مکان کی چھت پر سے موت چیختے چنگھاڑنے لگی۔ مشین گن کی تڑاتڑ نے سمجھادیا کہ اندھی برف باری میں وہ سب مکان کے بہت قریب چلے آئے تھے مگر جب موت سمجھاتی ہے تو پچھتاوے کی مہلت بھی نہیں ملتی۔ مشین گن کے ایک ہی برسٹ میں وہ سب چیختے چلاتے برف میں دھنس گئے۔ عشام جعفری بیلے کرونا اور فادر بنجامن نے اتنی مضبوطی سے ہونٹوں کو بند رکھا تھا کہ موت کی آخری ہچکی کو بھی نکلنے نہ دیا مرنے کے بعد بھی جگ جیت کی بتیسی نکلی ہوئی تھی۔

چھت پر سے فائرنگ بدستور جاری تھی۔ مشین گنوں سے کبھی نزدیک اور کبھی دور گولیاں برس رہی تھیں۔ کچھ گرینیڈ بھی دور آکر دھماکوں سے پھٹنے لگے۔ پھر اچانک خاموشی چھاگئی۔ کیپٹن بینٹنک کے ساتھ جو سپاہی کھڑے ہوئے تھے وہ جواباً فائرنگ کرتے ہوئے دور بھاگنے لگے۔ کھلے میدان میں وہ بچ کے نہیں بھاگ سکتے تھے لیکن رینج سے باہر نکلتے نکلتے ان میں سے کتنے ہی گولیاں کھاکر گر پڑے۔ پھر ایک نئی افتاد آپڑی۔ جدھر وہ بھاگ رہے تھے ادھر سے بھی اچانک فائرنگ شروع ہوگئی۔ محبانِ وطن اپنی آزادی کا قرض چکانے آگئے تھے۔

مکان کی چھت خاموش تھی۔ دور برفباری کے اجلے اندھیرے میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ فائرنگ کی مسلسل آوازوں کے ساتھ چیخیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ سپاہی اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کچھ راستے سے بھٹک کر مکان کی طرف آئے تو چھت کی خاموشی پھر تڑاتڑ چیخنے لگی۔ کھلے میدان میں ایک گرینیڈ کا دھماکہ ہوا۔ پھر اس چھت پر پہلے جیسا سناٹا چھاگیا۔ وہ مکان فوجیوں کے لئے آسیب زدہ ہوگیا تھا اب وہ بھاگتے وقت سمتوں کا تعین کرتے تھے اور اس مکان کی طرف جانے سے کتراتے تھے۔ صبح ہوتے ہوتے بھاگنے اور بھٹکنے والے موت کی گود میں جاکر سوگئے۔ اس صبح فوجی بینڈ کے کچھ ساز بدل گئے اب اس جزیرے کا قومی ترانہ سنائی دے رہا تھا۔ محبانِ وطن کی دوسری جماعت نے کرنل کی فوجی پناہ گاہ پر قبضہ کرنے کے بعد کرنل لارنس کو گولی ماردی تھی۔ دن کا اجالا پھیلتے ہی بستی کے لوگ گلیوں اور سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ دکانیں کھل گئی تھیں۔

بہت سے لوگ ایک جلوس کی صورت میں اپنے چار بڑوں کی لاشیں اٹھانے

آئے۔ ان چاروں نے اپنے ملک کے رہنما بننے کا حق ادا کردیا تھا۔ چند محبانِ وطن نے چھت کی طرف سر اٹھاکر الوینہ کو آواز دی کہ وہ اپنے جانباز ساتھیوں کے ساتھ نیچے آجائے۔ اب خطرہ نہیں ہے۔ کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ اس دلنواز محبوبہ کا صرف ایک ہی ساتھی ہے۔ جب الوینہ کی طرف سے جواب نہ ملا تو انہیں تشویش ہوئی۔ وہ دروازہ توڑ کر مکان میں داخل ہوگئے زینے پر برف جمی ہوئی تھی۔ وہ بیلچوں سے برف ہٹاتے ہوئے اوپر پہنچ گئے۔

چھت پر کوئی نظر نہیں آیا۔ تمام رات قیامت کی برف باری ہوتی تھی۔ منڈیر کی اونچائی سے اوپر بھی برف ہی برف نظر آرہی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کے جانباز ساتھی کہاں ہیں' وہ سب آہستہ آہستہ بیلچوں سے برف ہٹانے لگے تاکہ گہری نیند سونے والے بیلچوں کی زد میں نہ آئیں۔ بڑی دیر کے بعد ایک جگہ "ٹھن" کی آواز آئی۔ ایک بیلچہ مشین گن سے ٹکرایا تھا۔ پھر وہ بیلچے رکھ کر اپنے ہاتھوں سے برف کی تہہ کو کریدنے لگے۔ دھیرے دھیرے پردہ سرکنے لگا۔ آہستہ آہستہ الوینہ اور سلمان اجاگر ہونے لگے۔

وہ دونوں لکڑی کے ایک تختے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ الوینہ اپنے سلمان کے ایک بازو کے احاطہ میں اس طرح بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کا چہرہ سپاہی کے سینے پر ایک تمغہ کی طرح سج گیا تھا۔ سلمان کا دوسرا ہاتھ مشین گن پر رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے سینے لگے محبت کا رت جگا منا رہے تھے۔

ربا.........! پیار کرنے والوں کو نیند کیوں نہیں آتی؟ ہائے' وہ کھلی آنکھوں سے کب تک جاگتے رہیں گے؟

☆=====ختم شد======☆

تھے۔ ہر صاحبِ اقتدار کو زندہ باد کہنے کے عادی ہو گئے تھے۔

خالد کا دل ڈوب رہا تھا۔ ثمینہ نظر نہیں آرہی تھی۔ اسے ابھی تک اندر نہیں بلایا گیا تھا فریج اگلے دروازے سے نہیں جاسکتا تھا۔ اسے پچھلے دروازے سے لایا جارہا تھا۔ بھابی جان اس سے بھی کہہ سکتی تھیں۔ "اب تم صاف ستھرے راستے سے آنے کے قابل نہیں رہے۔ گندی گلی سے آجاؤ۔"

لیکن انہوں نے یہ بات بھی جھوٹے منہ سے نہیں کی۔ اسے کسی سے نہیں، صرف ثمینہ سے شکایت تھی۔ وہ کسی بہانے دروازے پر آسکتی تھی۔ کھڑکی کا پردہ سرکا کر اپنی ایک جھلک دکھلا سکتی تھی۔ اگر بھابی جان اپنی بہن کو پردہ کرا رہی تھیں تو پھر بھی ہزار بہانے ہیں۔ وہ اونچی آواز میں کسی سے بول سکتی تھی۔ دور سے اپنی آواز سنا سکتی تھی۔ اگر آواز پر بھی پابندی ہو تو وہ کھانسی کی آواز سنا سکتی تھی۔ اچانک کھانسی شروع ہوجائے تو کوئی اعتراض نہیں کرسکتا۔ زبان بند کرنے والے کھانسی پر پہرا نہیں بٹھا سکتے۔ دوسرے عاشقوں کی طرح ثمینہ بھی ایسے ہتھکنڈوں کو سمجھتی تھی مگر جانے کیوں خاموش تھی؟

سوزوکی آگئی۔ محلے کے جوان اس کے پچھلے حصے پر فریج کو اٹھا کر رکھنے لگے۔ وہ مایوس ہو رہا تھا۔ آخر یہ ہزاروں روپے کا سامان کس لئے آیا تھا؟ آدمی تنہا رہنے کے لئے کبھی دولت نہیں کماتا۔ عورت کی محبت اور رفاقت اسے ایماندارانہ محنت یا مجرمانہ کمائی کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر ثمینہ کی ایک جھلک نظر آجاتی تو اس کے یہ ہزاروں روپے وصول ہو جاتے۔

سوزوکی اسٹارٹ ہوئی۔ ایک جوان نے کہا۔ "خالد بھائی! آؤ بیٹھ جاؤ۔"

خالد نے بڑے دکھ سے دروازے اور کھڑکی کی جانب دیکھا۔ پھر التجا کی۔ "بھائیو! زحمت تو ہو رہی ہے۔ اتنی مہربانی اور کرو خود ہی پچھلے دروازے سے پہنچا دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

ایک بزرگ نے کہا۔ "ہمارا خالد بیٹا تھکا ہوا ہے۔ کیوں اسے تکلیف دیتے ہو، جاؤ یہ سامان پہنچا دو۔"

سوزوکی وہاں سے جانے لگی۔ خالد نے باقی لوگوں سے رخصتی مصافحہ کیا پھر اپنے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ بہت پہلے ہی بند ہو چکا تھا۔ اس کا مطلب

یہ ہو سکتا تھا کہ اسے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا تھا کہ گھر کے افراد یہ دروازہ بند کر کے پچھلے دروازے کی طرف چودہ ہزار کے فریج کا استقبال کرنے گئے ہیں اور اس دروازے سے خالد کے آنے کی توقع کر رہے ہیں۔

وہ دروازے سے پلٹ کر جانے لگا ایسے ہی وقت اس کے قدم رک گئے، کانچ کی ایک چوڑی اس کے پاؤں کے پاس آکر گری اور ٹوٹ گئی۔ اس نے جلدی سے سر گھما کر دیکھا۔ کھڑکی کے پردے سے باہر آکر چوڑی کی آواز میں بولنے والا نازک سا ہاتھ فوراً ہی اندر جارہا تھا۔

اس نے خوش ہو کر خوب گہری سانس لی، جیسے گورے گورے ہاتھ کی خوشبو سینے میں کھینچ رہا ہو۔ پھر سانس بھر کے بولا۔ "ثمینہ!"

کھڑکی چپ تھی۔ ہلنے والا پردہ ساکت ہو گیا تھا۔ بہت دور گھر کے پچھلے حصے سے ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ شاید سامنے والی کھڑکی میں وہ تنہا تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم بول نہیں سکتیں۔ دیکھو، میں تمہیں جیتنے کے لئے کتنی بڑی رشوت لایا ہوں میں نہیں جانتا گھر والوں کے رویے میں تبدیلی آئے گی یا نہیں؟ مگر تم صورت تو دکھا دو۔ میں دو برس بعد آیا ہوں۔"

پردے کے پیچھے سے جواب نہیں آیا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا یہاں اور کوئی ہے؟"

اسے منجھلی بھابی کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہی تھی۔ "ثمینہ! یہاں کیا کر رہی ہو، اپنے کمرے میں جاؤ۔"

وہ جھینپ گیا۔ خود کو چور محسوس کرنے لگا۔ جبکہ اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی، اس کے اور ثمینہ کے عشق کا چرچا پورے خاندان میں ہوتا رہا تھا۔ اس کے باوجود دو برس بعد یوں لگ رہا تھا جیسے نیا عشق ہوا اور وہ نئی چوری پکڑی گئی ہو۔

وہ جانا چاہتا تھا۔ منجھلی بھابی نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر کہا۔ "سنو میاں! تمہارے بھائی صاحب مجھے شریف خاندان سے بیاہ کر لائے ہیں۔ ہمارے خاندان میں ایسی فلمی محبت کرنے والی لڑکیوں کو زہر دے کر مار ڈالتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے، ثمینہ تمہاری بڑی بھابی کی بہن ہے، اس کی جگہ میری بہن ہوتی تو............"

خالد نے بات کاٹ کر کہا۔ "تو آپ اسے زہر دے کر مار ڈالتیں۔ آپ ہزار بار